ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ انگریزی کہانیاں

CELEBRATING FIFTY YEARS
(1954-2004)

# دون کا سبزہ

رسکن بونڈ

www.taemeernews.com

# دون کا سبزہ

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ انگریزی کہانیاں

# دون کا سبزہ

مصنف

رسکن بونڈ

مترجم

ضیاء الرحمٰن صدیقی

ساہتیہ اکادمی

www.taemeernews.com

***Doon ka Sabza*** : Urdu translation by Zia-ul-Rahman Siddiqui of Sahitya Akademi's award winning English stories *Our Trees Still Grow in Dehra* by Ruskin Bond. Sahitya Akademi, New Delhi (2004), Rs.125.

© ساہتیہ اکادمی

پہلا ایڈیشن : 2004

# ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون-35 فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی 110001

سیلز آفس :

'سواتی'، منڈر مارگ، نئی دہلی 110001

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بھون، 23 اے/44 ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتا 700053

172، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالے مارگ، دادر، ممبئی 400014

سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور 560001

سی۔ آئی۔ ٹی۔ کیمپس، ٹی۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی۔ پوسٹ، تارامنی، چینئی 600013

قیمت : ۱۲۵ روپے

ISBN 81-260-1941-7

Website : http://www.sahitya-akademi.org

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد سالم 27/316 ترلوک پوری، دلی 110091

طباعت : آر۔ کے۔ آفسیٹ پروسس، دلی 32

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

# ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| | میپل وڈ : ایک تعارف | 09 |
| ⊘ | جاوا سے فرار | |
| ⊘ | کبڑا بھکاری | |
| 1 | اچھوت | 13 |
| ⊘ | ادنیٰ و اعلیٰ مخلوقات | |
| ⊘ | دہرہ دون کو واپسی | |
| 2 | خواہش | 18 |
| 3 | تانگے کا آخری سفر | 21 |
| 4 | کلپسو کرسمس | 37 |
| 5 | دہلی کا آخری سفر | 42 |
| 6 | وہ بھی کیا دن تھے | 48 |
| 7 | اور بینا چلی گئی | 53 |
| 8 | اور وقت گزر گیا | 65 |
| 9 | ابتدائی کہانیاں | 70 |
| 10 | مرگِ شجر | 84 |
| 11 | جنون | 87 |

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

# میپل وڈ : ایک تعارف

میپل وڈ چھوڑے ہوئے ابھی مجھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، پھر بھی یہ جان کر کوئی تعجب بھی نہیں ہوا کہ میپل وڈ کا نیچ اب وہاں نہیں رہا۔ پچھلے مہینے جب میں دہرہ گیا تھا تو پیڑ کٹنے شروع ہو گئے تھے اور کانیچ کے نیچے سے پہاڑی کو کاٹ کر نئی سڑک نکالنے کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت کانیچ کو توڑنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ لیکن وہ کانیچ اتنا بوسیدہ اور پرانا ہو گیا تھا کہ ٹرک کے گزرنے، ڈرل کے چلنے یا بلڈوزر کے جھٹکے سے کسی بھی وقت زمین پر گر سکتا تھا۔ اگر یہ کانیچ گرا بھی دیا گیا تو مجھے اس بارے میں کچھ کہنے، کسی کو لکھنے یا مزید جاننے میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

جب میں کانیچ کے ایک دوسرے حصّے میں داخل ہوا تو وہاں شاہ بلوط کے پیڑوں پر ستر سال پرانے گھونسلے موجود تھے اور اب تو وہ جنگل کا ایک حصّہ بن چکے تھے۔ پرندوں نے باقاعدہ اپنے گھونسلوں کے لیے جگہ بنالی تھی۔ بھنورے بھی لکڑی کے اندر اپنے رہنے کی جگہ بنا چکے تھے۔ بلّی نے کھپریل کے اوپری حصّے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ نئے پودے جو میری رہائش کے دوران نکلنے شروع ہوئے تھے اب وہ بھی پیڑ بن چکے تھے۔ میں نے اس کانیچ میں اپنی زندگی کے آٹھ نو سال گزارے تھے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ جگہ میرے رہنے کے لیے مناسب تھی بھی یا

010
www.taemeernews.com



نہیں، شاید اسی لیے کہ میں سال میں ایک بار اپنی سہولت کے مطابق کرایہ دیتا تھا۔

میں نے پہلی بار اس کاٹیج کو موسمِ بہار کے آخری دنوں میں دیکھا تھا۔ ان دنوں جنگل بہت ہرا بھرا ہوتا تھا اور وہاں شاہ بلوط اور میپل کے پیڑ تھے۔ ہمالہ میں پائے جانے والے میپل کی نئی پتّیاں سرخ اور سنہری ہوتی ہیں۔ ہمالہ کے میپل کی یہ قسم شمالی امریکہ کے میپل سے مختلف ہوتی ہے۔ دونوں میں صرف پَر والے بیج کی یکسانیت ہوتی ہے جو ہوا کے چلنے پر پتوں کے مڑنے سے زمین پر گر جاتے ہیں اور چاروں طرف اڑتے رہتے ہیں۔ گڑھوال کے لوگ اس پیڑ کو 'بٹر فلائی' کے نام سے پکارتے ہیں۔ کاٹیج کے قریب ایک بہت پرانا اور اونچا میپل تھا۔ شاید اس پیڑ کے نام پر ہی اس گھر کا نام میپل رکھا گیا ہوگا۔ اس کا ایک حصّہ بجلی گرنے سے کالا پڑ گیا تھا۔ میپل کے چاروں طرف کٹک بڑھئی چکر لگاتے رہتے تھے اور خوشی سے میٹھے میٹھے نغمے گایا کرتے تھے۔

کاٹیج میں جانے کے لیے نیچے کی طرف ایک ڈھلواں راستہ بنا ہوا تھا۔ برسات کے دنوں میں اس راستہ پر بہت تیز پانی بہتا تھا۔ پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے زمین تو دھل جاتی تھی لیکن راستہ پتھریلا اور اوبڑ کھابڑ ہو جاتا تھا۔ اسی راستے سے ہو کر میں مِس میکینزی سے ملنے گیا تھا۔ وہ ایک نادار اور کمزور عورت تھی۔ اس کاٹیج میں مِس میکینزی کے پاس رہنے کے لیے دو کمرے تھے۔ مالک مکان نے اس کاٹیج کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری مِس میکینزی کے سپرد کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کاٹیج کا اوپر کا کمرا کرایے کے لیے خالی ہے اور نیچے کے حصّے میں وہ خود رہتی ہے۔

کاٹیج کا ایک راستہ نیچے کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راستہ اوپر کی طرف پہلی منزل کے دروازے تک پہنچتا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر پہاڑی کی وجہ سے دھوپ بھی نہیں آتی تھی۔ تیز بارش کے زمانے میں راستے میں پانی بھرا رہتا تھا جس سے گھر کے اندر پہنچنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

مِس میکینزی کی عمر چھیاسی سال ہو چکی تھی۔ میری مدد سے سیڑھیاں چڑھ کر انھوں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور وہ مجھے 'ایل شیپ' روم میں لے گئیں۔ اس کمرے میں دو بڑی کھڑکیاں تھیں۔ میں نے پہلی کھڑکی کو زور سے کھولا تو دور تک پھیلا

011
www.taemeernews.com



ہوا گھنا جنگل دکھائی دیا۔ وہاں مجھے میپل، شاہ بلوط اور اخروٹ کے علاوہ اور بہت سے جنگلی پیڑ والہانہ انداز میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے نظر آئے۔ ایک پیڑ کی ایک شاخ تو کھڑکی کے دروازے پر لٹکی ہوئی تھی۔ نیچے کی طرف کسی پرندے کے گلے سے نکلتی ہوئی تیز سیٹی کی آواز سنائی دی۔

میں نے مِس میکینزی سے کہا کہ یہ جگہ مجھے پسند ہے۔ یہ سن کر انھیں بہت خوشی ہوئی۔ وہ کئی سال سے اس کاٹیج میں تنہا رہا کرتی تھیں اور اس کاٹیج کا اوپری حصہ بہت دنوں سے خالی پڑا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ان کا ایک پرانا نوکر اور مخلوط نسل کا ایک کتا رہتا تھا۔ میکینزی نے کچھ رقم لے کر اپنا گھر رہن رکھ دیا تھا۔ ان کے بھائی بہنوں کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ مِس میکینزی کا اس دنیا میں اب کوئی نہیں تھا اور وہ تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ یہ سب باتیں انھوں نے مجھے بتائی تھیں۔

میں نے ان سے کہا کہ میں جلد ہی اس کاٹیج میں رہنا شروع کر دوں گا۔ میری کتابیں ابھی دہلی میں پڑی ہوئی ہیں۔ میں نے مِس میکینزی کو ایک چیک دیا اور انھوں نے اس کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔

یہ سب کچھ جذباتی طور پر ہو گیا۔ میں نے دہلی میں نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ہل اسٹیشن پر ایک سستا مکان کرائے پر لے کر ایک پیشہ ور ادیب کے طور پر لکھنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے پیسے کی کمی محسوس ہوئی اور ایسا لگا کہ میرے خواب پورے ہونے مشکل ہو جائیں گے۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ اگر میں پیسے آنے کا انتظار کرتا رہا تو اس انتظار میں میرے بالوں پر سفیدی چھا جائے گی اور میں بوڑھا اور کمزور ہو جاؤں گا۔ لیکن میری عمر ابھی پینتیس سال تھی۔ جوانی کے اس دور میں خطروں سے کھیلا جا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں اپنے خوابوں کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح میپل وڈ تک پہنچ گیا اور پہلی ہی نظر میں وہ جگہ مجھے پسند آ گئی۔ اس لیے میں نے کسی دوسری جگہ کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ اس جگہ کا محلِ وقوع بہت اچھا تھا۔ اس کا رُخ مشرق کی جانب تھا اور سامنے بالا حصار کی پہاڑی دکھائی دیتی تھی۔ صبح کے نکلتے سورج کی دھوپ وہاں آتی تھی۔ لیکن شام کے

012
www.taemeernews.com



ڈھلتے سورج کی دھوپ وہاں نہیں پہنچتی تھی۔ شام کو تین بجے سے پہاڑی کا سایہ کاٹیج کے اوپر آجاتا تھا اور سورج کی روشنی کاٹیج کی چھت سے آہستہ آہستہ ڈھلنے لگتی۔ گرمی کے موسم کے لیے یہ کاٹیج بہت اچھا تھا لیکن سردی کے موسم میں یہاں ٹھنڈ اور اندھیرا رہتا تھا۔

کاٹیج کی اس کھڑکی سے نہ برفیلی پہاڑیاں دکھائی دیتی تھیں اور نہ کوئی کھلا میدان۔ اس کے سامنے ایک جھلسی ہوئی پہاڑی تھی جسے لوگ پَری ٹبا کہتے تھے۔ بجلی کے بار بار گرنے سے پہاڑی کا وہ حصہ جھلس کر کالا پڑ گیا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھولنے پر کاٹیج کے نیچے دور تک پھیلے ہوئے گھنے اور ہرے بھرے جنگل کو دیکھ کر تمام طرح کے امکانات کا ازالہ ہو جاتا تھا۔ میرے رومانی ذہن کے لیے وہ ایک جادوئی اور حساس کھڑکی تھی۔

اس کھڑکی کے پاس میں نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک آرام کرسی بنائی تھی۔ گرمی کے دنوں میں اکثر میں اس پر دراز ہو کر شعر لکھتا اور انھیں گنگناتا رہتا تھا۔ مِس میکینزی سے میں اپنے گزرے ہوئے زمانے کی باتیں کرتا۔ گفتگو کے دوران پریم اور دوسرے لوگ جیسے بیناوغیرہ کا بھی ذکر آجاتا تھا۔

کچھ عرصے کے لیے میں پہاڑیوں سے دور چلا گیا تھا لیکن بہت جلد واپس آگیا۔ پہاڑوں سے آشنا ہونے کے بعد فطری طور پر ان سے ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے، کیونکہ پہاڑوں کی خوبصورتی کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

میری بیشتر کہانیاں (جن میں میرے بچپن کا ذکر ہے) میپل وڈ میں لکھی گئیں۔ ان میں سے بہت سی کہانیاں The Night Train at Deoli اور Time Stops at Shamli میں شامل ہیں۔

زندگی سے جدوجہد کرنے والا یہ نوجوان ادیب "رسکن بونڈ" اس پرانے کاٹیج "میپل وڈ" کا آج بھی رہین منت ہے۔

رسکن بونڈ

مسوری

اکتوبر 1991

www.taemeernews.com

# اچھوت

صفائی کرنے والے لڑکے نے دروازے پر لٹکی ہوئی خس کی میٹ پر پانی پھینکا اور کچھ دیر کے لیے ہوا ٹھنڈی ہو گئی۔

میں بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا اور کھڑکی کے باہر تکنے لگا۔ سڑک گرد آلود تھی اور دوپہر کی دھوپ میں تمازت تھی ایک کار کے گزرنے سے گرد بادلوں کی طرح فضا میں اڑنے لگی۔

سڑک کی دوسری طرف جو لوگ رہتے تھے وہ میری دیکھ ریکھ کر رہے تھے۔ ان دنوں میرے والد ملیریا ہونے کی وجہ سے اسپتال میں تھے۔ میں انھیں کے ساتھ رہتا، انھیں کے ساتھ سوتا لیکن ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا تھا (الگ کھاتا تھا) کیونکہ وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے اور میں انھیں پسند نہیں کرتا تھا۔

غالباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور میں تنہا لال اینٹوں والے بنگلے میں جو شہر سے دور جنگل کے کنارے تھا، تنہا رہ رہا تھا۔ رات کے وقت صفائی کرنے والا لڑکا چوکیداری کے لیے آتا اور رسوئی میں سو جاتا۔ پڑوس کے بچوں کے علاوہ میرے ساتھ کھیلنے کے لیے دوسرا کوئی نہ تھا۔ میں انھیں پسند نہیں کرتا تھا اور وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔

ان بچوں کی ماں مجھ سے کہتی تھی کہ صفائی کرنے والے لڑکے کے ساتھ

014
www.taemeernews.com



مت کھیلا کرو۔ وہ گندا ہے۔ اسے مت چھونا۔

میں نے ایک ہفتہ بستر پر بیٹھ کر گزارا اور اپنے والد کے گھر واپس آنے کا انتظار کرتا رہا۔

صفائی کرنے والا لڑکا پورے دن پانی کے ٹینک اور گھر کے درمیان تیزی سے اوپر نیچے آتا جاتا رہتا اور بالٹی اس کے گھٹنوں سے ٹکراتی رہتی۔ آتے جاتے ہوئے وہ ایک بکھری دوستانہ مسکراہٹ دیتا۔

میں نے اس کی طرف گھورا۔

وہ تقریباً میرا ہم عمر دس سال کا ہوگا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے گھنگھرالے بال اور بہت سفید دانت تھے۔ اس کا منہ اور ہاتھ پیر مٹی سے لت پت تھے اور وہ بہت خاکی رنگ کا چھوٹا سا جوڑا پہنتا اور جسم کا باقی حصہ کھلا ننگا رہتا۔ اس کی کھال جھلسی ہوئی تھی۔ ہر بار جب بھی وہ پانی کے ٹینک پر جاتا، نہا کر آتا اور سر سے پیر تک پانی میں شرابور اور بھیگا ہوا ہوتا جبکہ میرے جسم سے پسینہ ٹپک رہا ہوتا۔

ٹینک پر جا کر نہانا میرے رتبہ سے کم درجہ کی بات تھی۔ کیونکہ وہاں مالی، پانی لانے والے، باورچی، نوکر اور مہتر جمع ہو کر نہاتے تھے۔ میں ایک بڑے آدمی کا بیٹا تھا اور رواج کے مطابق صاحب کے بچے نوکروں کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلتے تھے۔

لیکن میں نے دوسرے "صاحب" کے بچوں کے ساتھ نہ کھیلنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا، کیونکہ وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے اور میں انھیں پسند نہیں کرتا تھا۔

میں کھڑکیوں کے شیشہ سے چھپکلیوں کو ناہموار اور کھردرے چھیدوں سے گزرتے اور جھلسے ہوئے پرانے پھولوں کو ہوا سے منتشر ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔

صفائی کرنے والا کالڑکا مسکرایا اور کھیل کھیل میں اس نے سلام کیا۔ میں نے نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "چلے جاؤ!" اور وہ رسوئی میں چلا گیا۔

میں اٹھا اور کمرے سے باہر آیا اور کیپ ہیٹ اسٹینڈ سے سورج سے بچنے والا کیپ ہیلمیٹ اٹھایا۔

ایک کنکھجورا دیوار پر رینگتا ہوا فرش پر آگرا۔ میں ڈر سے چیختا ہوا بیڈ پر چڑھ

015
www.taemeernews.com



گیا اور مدد کے لیے چلایا۔ صفائی کرنے والا لڑکا اندر کی طرف دوڑا۔ اس نے دیکھا کہ میں بیڈ پر چڑھا ہوا تھا اور کنکھجورا فرش پر پڑا تھا۔ اس نے الماری سے ایک بڑی سی کتاب اٹھائی اور کتاب سے اس گھناؤنے کیڑے کو مار دیا۔

میں اپنے بیڈ پر ہی کھڑا رہا۔ میں ڈر سے کپکپا رہا تھا۔ وہ مجھ پر قہقہہ مار کر ہنسا اور میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''باہر چلے جاؤ۔''

میں اتنا ڈرا ہوا تھا کہ ہیٹ یا ہیٹ اسٹینڈ کو چھونے یا اس تک پہنچنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی اور میں بیڈ پر بیٹھ کر اپنے والد کے گھر واپس آنے کی خواہش کرنے لگا۔

ایک مچھر اڑتا ہوا میرے قریب آیا اور کان پر بھنبھنانے لگا۔ میں نے بددلی سے اس کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ نکلا اور ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے چھپ گیا۔

اسی مچھر کی وجہ سے میرے والد ملیریا کا شکار ہوئے اب وہ مجھے بھی اس مرض میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔

کھڑکی کے باہر پڑوس کی ایک عورت ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیتی ہوئی کمپاؤنڈ سے گزر گئی اور میں نے جواباً اسے گھورا۔

صفائی کرنے والا لڑکا بالٹی ہاتھ میں لٹکائے ہوئے دانت پیستا ہوا وہاں سے گزرا اور میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

رات کو میں نے لائٹ جلائے رکھی اور پڑھنے کی کوشش کی لیکن کتابیں بھی میری بے چینی ختم نہ کر سکیں۔

صفائی کرنے والے لڑکے نے گھر کے اندر چکر لگایا، دروازے بند کیے، کھڑکیاں بند کیں اور اس نے پوچھا: ''میرے لیے کوئی حکم؟''

میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے منع کر دیا۔

اس نے لائٹیں بند کیں اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اندر اور باہر سب طرف اندھیرا چھا گیا۔

صفائی کرنے والے لڑکے کے دروازے کی جھری سے کچھ روشنی دکھائی

016
www.taemeernews.com



دے رہی تھی پھر وہ بھی بند ہو گئی۔

چاروں طرف سناٹا اور خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی نے مجھے پریشان کر دیا اور میں سوچنے لگا کہ کاش میں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رہتا تو اچھا تھا۔

ایک چمگادڑ اڑتی ہوئی آئی اور سیدھی کھڑکی سے ٹکرا کر زمین پر گر گئی۔ پھر الّو کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ کبھی کبھی کتّوں کے بھونکنے کی آواز بھی آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگلے کے پیچھے گیدڑ چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ لیکن رات کا سناٹا اسی طرح چھایا رہا۔

صرف ایک ہوا کا جھونکا۔

پیڑوں کے پتوں کی سرسراہٹ سے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ سوکھی ٹہنیوں کی سوکھی ہوئی پتیوں پر جیسے سانپ رینگ رہے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ صفائی کرنے والے لڑکے کو کچھ دن پہلے ایک سانپ نے کاٹ لیا تھا۔

میں نہیں سویا کیونکہ نیند ہی نہیں آئی۔ میں اپنے والد کو یاد کرنے لگا۔

شٹر اور دروازے سے کھڑکھڑ کی آواز سنائی دی۔

بھوت۔ یہ بھوت پریتوں کی رات تھی۔

اَے خدا، میں ان کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں۔

میرے والد! میرے والد جو ملیریا سے مر رہے تھے، میں نے انھیں پکار کر کہا کہ آؤ اور مجھے دیکھو۔

میں سوئچ کی طرف تیزی سے دوڑا اور سوئچ دباتے ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ بیڈ پر لیٹ کر میں نے بہت سے کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھک لیا۔ میرا نائٹ سوٹ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔

میں جسے اپنا والد سمجھ رہا تھا، وہ دراصل ان کی گون تھی جو غسل خانے کے دروازے سے لٹکی ہوئی تھی۔ شاید اسے وہ اسپتال لے جانا بھول گئے تھے۔

میں نے دوبارہ اٹھ کر لائٹ بجھا دی۔

خاموشی باہر بڑھتی جا رہی تھی۔ میں کنکھجورے، سانپ اور اس سوئے ہوئے

017
www.taemeernews.com



لڑکے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے چادر سے کس کر اپنا منہ ڈھک لیا تاکہ مجھے کچھ دکھائی نہ دے اور پھر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

بجلی کی چمک نے سکوت توڑ دیا۔

بجلی کی تیز چمک آسمان کا سینہ چیرتی ہوئی اتنے قریب آگئی تھی کہ چادر کے اندر سے بھی مجھے پیڑ اور گھر کا عکس واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے تکیے کو سمیٹ کر اپنے کان پر رکھ لیا اور چادر میں اچھی طرح چھپ گیا لیکن اس مرتبہ بجلی کی کڑک پہلے سے زیادہ تیز تھی اتنی تیز کہ اس سے پہلے شاید میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ میں اپنے بیڈ سے کودا اور بھاگ کر صفائی کرنے والے لڑکے کے کمرے میں جا گھسا۔

میں نے کہا : ''میں بہت ڈرا ہوا ہوں۔''

میں نے اس کی طرف آگے بڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ سے اس کے کندھے کو چھوا جو ٹھنڈا تھا : ''یہیں ٹھہرو'' اس نے کہا، ''مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے۔''

میں دیوار کی طرف پیٹھ کر کے اس اچھوت کے پاس بیٹھ گیا۔ بجلی کی چمک اور کڑک بند ہو گئی۔ بارش شروع ہو گئی اور جھری دار چھت سے چھم چھم اور ٹپ ٹپ ہونے لگی۔

صفائی کرنے والے لڑکے نے میری طرف مڑ کر کہا کہ بارش شروع ہو گئی ہے۔ وہ اندھیرے میں مذاق کے انداز میں مسکرایا اور پھر اس نے قہقہہ لگایا۔ میں بھی نحیف آواز میں ہنسنے لگا۔

میں بہت خوش تھا کیونکہ میں اب اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ بجلی چمکی۔ تیز بارش شروع ہو گئی اور گیلی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔

www.taemeernews.com

# خواہش

ایک بوڑھا فقیر جس کی جھکی ہوئی کمر، لہراتی ہوئی سفید ڈاڑھی اور پُر تجسس آنکھیں تھیں، سڑک کے دوسرے جانب باغیچے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا اور میں لیچی کے پیڑ کی شاخ کو پکڑے ہوئے کھڑا تھا۔

''تمھاری کیا خواہش ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

سڑک کے اس پار کھڑے ہوئے اس بوڑھے فقیر نے بڑا عجیب سوال کیا۔

اور اس نے سوال بھی انگریزی میں کیا جبکہ ان دنوں انگریزی بولنے والے فقیر بہت کم پائے جاتے تھے۔

''تمھاری کیا خواہش ہے؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

مجھے یاد نہیں میں نے کیا کہا۔

شاید میں نے گزشتہ رات کوئی خواب دیکھا تھا۔

جو تم سمجھ رہے ہو میرا وہ مطلب نہیں ہے۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم صرف خواب ہی دیکھتے ہو۔

یہ لیچی کا موسم نہیں ہے پھر بھی تم ہر سہ پہر کو یہاں بیٹھ کر خواب دیکھتے رہتے ہو۔

مجھے یہاں بیٹھنا اچھا لگتا ہے مگر میں خواب نہیں دیکھتا۔

019
www.taemeernews.com



دوسرے لڑکوں کی بھی کوئی خواہش نہیں ہے۔ وہ تو صرف تتلیوں کے ساتھ کھیلتے رہتے ہیں۔

"لڑکے۔ زندگی میں زیادہ سے زیادہ پانے کی خواہش ہے تمھیں!"

"ہاں۔" اس نے کہا۔ "میرا ایک کمرہ ہے۔"

"اوہ۔ تمھارا اپنا ایک کمرہ، تمھارا اپنا ایک درخت، بہت سے لوگوں کے پاس تو اپنا کمرہ تک نہیں ہے۔"

"بتاؤ ان دنوں تم کس طرح کے کمرے میں رہتے ہو؟"

"یہ ایک بڑا کمرہ ہے لیکن اس میں میرا بھائی، میری بہنیں اور کبھی کبھی میری آنٹی بھی آکر رہتی ہیں۔"

"میں سمجھ گیا کہ تم آزادی چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ تمھارا اپنا کمرہ، اپنا درخت سورج کی روشنی میں اپنی جگہ ہو۔"

"ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔"

"بس یہی مسئلہ ہے اور جب تمھیں یہ سب کچھ مل جائے گا تو تمھاری خواہش پوری ہو جائے گی۔"

"بتاؤ کس طرح تم یہ سب کچھ حاصل کرو گے۔ میرے دوست یہ کوئی جادوئی چیز نہیں ہے۔ میں اگر خدا کا نیک بندہ ہوتا تو تمھارے ساتھ اپنا وقت ضائع نہ کرتا۔ تمھیں اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے جٹ جانا چاہیے اور جو رکاوٹ تمھارے راستے میں آئے اسے ہٹادو۔ لیکن آزادی حاصل کرنے کے لیے اس سب کچھ کے حصول کی بہت جلدی امید نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے لیے بہت سی مشکلوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔"

"اس کے بعد!"

"ہاں۔ کیونکہ یہ سب کچھ بہت آسانی سے کھو بھی سکتا ہے اور کوئی تم سے چھین بھی سکتا ہے۔ یا تم لالچی اور لاپروا ہو جاؤ گے اور اچانک تمھارا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔"

020
www.taemeernews.com



"میں نے پوچھا۔ تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟"

"کیونکہ میرا بھی ایک خواب تھا جو پورا نہ ہو سکا۔"

"کیا تمھارا سب کچھ ختم ہو گیا؟"

"ذرا میری طرف دیکھو! میرے دوست کیا میں تمھیں کوئی راجا یا خدا کا نیک بندہ لگتا ہوں؟ میری خواہش کے مطابق میرے پاس ہر چیز موجود تھی لیکن میری خواہشات بڑھتی گئیں۔۔۔ایک گھر ملنے کے بعد تمھیں ایک بلڈنگ کی خواہش ہو گی۔ بلڈنگ حاصل کرنے کے بعد تم ایک علاقہ کی خواہش کرو گے اور علاقہ پانے کے بعد تم اپنی ایک سلطنت چاہو گے لیکن یہ سب پانا بہت مشکل ہو گا۔"

"کیا تمھاری کوئی سلطنت تھی؟"

"کچھ اسی طرح۔۔۔ لڑکے دوسرے کے خوابوں کو نہ اپناؤ اپنے خوابوں پر چلو۔ دوسروں کے راستوں پر نہ چلو۔ دوسرے کے عزائم، اس کا گھر اور اس کے گیتوں کو نہ اپناؤ۔ اور وہ شاعری کی طرف رجوع ہوا اور خوش الحان لہجے میں دو مصرعے پڑھے جو میں نے شاید کبھی نہیں سنے تھے۔ وہ یقیناً اس کے اپنے تھے۔

"جگ جگ جیو میرے دوست خدا تمھیں ہمت اور طاقت عطا کرے لیکن کبھی کسی کی خوشی کو اس سے نہ چھیننا۔"

میں لیچی کے درخت کے پاس کھڑا ہوا اس کی ذہانت پر غور کرتا رہا۔ مجھے تعجب تھا کہ اتنا عقلمند آدمی بھی کیا اتنا غریب ہو سکتا ہے۔ شاید اس کے بعد ہی وہ اتنا عقلمند ہوا ہو۔ بہر حال وہ چلا گیا اور میں بھی اپنے گھر لوٹ آیا۔ مجھے ایک کمرے کی خواہش تھی جو مل گیا۔

میں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ آزادی ایک ایسی چیز ہے جسے بنائے رکھنے کے لیے بہت چوکس رہنا پڑتا ہے

www.taemeernews.com

# تانگے کا آخری سفر

دہرہ دون میں یہ بہار کا موسم تھا اور بنگلے کی دیواریں پھولوں سے لدی بڑی بڑی شاخوں سے گھری ہوئی تھیں۔ پپیتے پک چکے تھے اور پھولوں کی بھینی مہک باغ کے باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ دادی ماں برآمدے کے ایک کونے میں آرام کرسی پر بیٹھی تھیں اور سلائیوں سے بنتے ہوئے ان کا سر ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا۔ وہ میرے والد کے لیے بڑا سوئیٹر تیار کر رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ دہلی میں بہت سردی ہوتی ہے۔ سردی کا موسم شروع ہونے سے آٹھ ماہ قبل ہی انھوں نے ہمارے لیے گرم کپڑوں کی تیاری شروع کر دی تھی۔

کاٹھیاواڑ بحر عرب کے ساحل پر واقع تھا اور اس کے گرم پانی کی وجہ سے وہاں زیادہ سردی نہیں ہوتی تھی لیکن دہرہ دون ہمالیہ کے پہلے ہی سلسلہ کے دامن پر واقع ہونے کی وجہ سے ٹھنڈا تھا۔

دادی ماں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ ان کی بینائی بھی کمزور تھی لیکن ان کی انگلیاں سوئیٹر بننے والی سلائیوں پر بہت تیزی سے چلتی تھیں اور صبح سویرے ہی سے وہ اس کام میں لگ جاتی تھیں۔

دادی ماں کی نظر بچتے ہی میں Geranium کے پتوں کو اپنی انگلیوں سے مسلتا اور ناک پر رکھ کر دبا دیتا۔

022
www.taemeernews.com



میں تقریباً ایک ماہ سے اپنی دادی کے پاس دہرہ دون میں رہ رہا تھا لیکن اس دوران میں نے اپنے والد کو وہاں نہیں دیکھا۔ اس سے پہلے کبھی ہم اتنے لمبے عرصہ کے لیے ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے تھے۔ ہر ہفتہ وہ مجھے کتابیں، تصویریں اور پوسٹ کارڈ وغیرہ بھیجا کرتے تھے اور میں پوسٹ مین کی تلاش میں سڑک پر دور تک چلا جاتا کہ شاید کوئی خط میرے لیے اس کے پاس ہو۔

دروزے پر تانگے کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی اور جانی پہچانی گھوڑا گاڑی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی دروازے پر آ پہنچی۔

''میں دیکھتا ہوں کون ہے۔'' یہ کہتا ہوا میں برآمدے کی سیڑھیوں سے ہوتا ہوا باغیچہ میں پہنچا۔

وہ بنسی کا تانگہ تھا۔ یوں تو دہرہ دون میں بہت سے تانگے اور تانگا چلانے والے تھے لیکن بنسی میرا پسندیدہ تانگے والا تھا۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا اور ہمیشہ صاف ستھری قمیض اور پاجامہ پہنتا تھا۔ اس کا گھوڑا دوسرے تانگے والوں سے زیادہ صحت منداور تیز رفتار تھا۔

بنسی کے تانگے میں کوئی سواری بیٹھی ہوئی نہیں تھی اس لیے میں نے اس سے پوچھا : ''بنسی تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''دوست، تمھاری دادی نے مجھے بلایا ہے۔'' وہ مجھے چھوٹے صاحب یا باب نہیں کہتا تھا بلکہ دوست کہہ کر پکارتا تھا۔ یہ لفظ میرے لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے تانگے والے کی دوستی پر فخر تھا۔

میں برآمدے سے دوڑتا ہوا آیا اور دادی ماں سے پوچھا : ''آپ کہاں جارہی ہیں؟''

''میں بینک جارہی ہوں۔''

''کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟''

''کس لیے؟ تم بینک جاکر کیا کروگے؟''

''میں اندر نہیں جاؤں گا۔ میں بنسی کے ساتھ تانگے میں ہی بیٹھا

023
www.taemeernews.com



رہوں گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، آجاؤ۔"

ہم نے دادی ماں کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے میں مدد کی اور میں بنسی کے پاس ہی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے گھوڑے سے کچھ کہا اور گھوڑا ایک جھٹکے کے ساتھ دروازے سے نکل کر تیزی سے سڑک پر آگیا۔

"بنسی ذرا آہستہ چلو۔" دادی ماں نے کہا۔ انھیں تانگا، موٹر کار یا بیل گاڑی وغیرہ ایسی کوئی بھی تیز رفتار چیز پسند نہیں تھی۔

بنسی نے جواب دیا۔ "میم صاحب تیز رفتاری سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ گھوڑا تو اپنی زندگی میں کبھی تیز چلا ہی نہیں ہے۔ اگر ہمارے پیچھے بم بھی پھٹ رہا ہو تب یہ بھی تیز نہیں دوڑ پائے گا۔ میرے پاس ایک تیز رفتار گھوڑا بھی ہے جس کو میں اس وقت استعمال کرتا ہوں جب سواری بہت جلدی میں ہوتی ہے۔ میم صاحب یہ گھوڑا صرف آپ کے لیے ہے۔"

دادی ماں کو دوسرے گھوڑ کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

دس منٹ سفر کرنے کے بعد ہم بازار میں الہ آباد بینک پہنچ گئے جہاں دادی ماں کو جانا تھا۔ دادی ماں بینک میں چلی گئی اور ہم گھنٹہ گھر کے پاس کھڑے ہو گئے۔ دادی ماں کو تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد واپس آنا تھا، اس لیے میں اور بنسی دُکانوں کے سامنے گھومنے لگے۔ گھوڑے کے کھانے کے لیے کچھ چارہ چھوڑ دیا تھا۔

"تمھارے پاس کچھ پیسے ہیں؟" بنسی نے پوچھا۔

"چار آنے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"دو کپ چائے کے لیے بہت ہیں۔" بنسی نے کہا۔

وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چائے کی دُکان کی طرف چل پڑا اور میں نے پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

میں نے اس سے کہا : "اگر تم چائے پسند کرتے ہو تو پی سکتے ہو۔ لیکن میں لیموپانی پیوں گا۔"

024
www.taemeernews.com



"ٹھیک ہے دوست ایک چائے اور ایک لیموپانی۔"

بنسی نے چائے والے کے نوکر سے کہا: "ہمارے لیے پہلے پانی لے کر آؤ۔"

پانی پیتے ہوئے بنسی نے گھوڑے کی طرح آواز نکالی اور میں اس جگہ کی ہریالی سے لطف اندوز ہوتا رہا جو لیموپانی سے کئی گنا زیادہ مزیدار تھی۔

دادی ماں جب بینک سے باہر آئیں تو وہ شاید کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ انھوں نے زیادہ بات چیت بھی نہیں کی اور گھر واپس آتے ہوئے انھوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ تہذیب کے دائرے میں رہو، کیونکہ میں گھوڑے کے ساتھ کھلواڑ کر رہا تھا۔ بنسی کو پیسے دے کر وہ سیدھی گھر کے اندر چلی گئیں۔

میں نے بنسی سے پوچھا: "تم پھر کب آؤ گے؟"

"دوست، جب بھی میری خدمت کی ضرورت پیش آئے گی، میں آجاؤں گا۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنی روزی روٹی کمانے میں لگا رہتا ہوں۔ بہر حال ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ آئندہ جب بھی میں کسی سواری کو چھوڑ کر یہاں سے گزروں گا، دروازے پر تانگے کے گھنگرو بجا کر تمھیں ضرور اطلاع کر دوں گا اور اگر تمھارے پاس خالی وقت ہوا تو بغیر کسی معاوضہ کے تم میرے ساتھ تانگہ پر سواری کر سکتے ہو۔ تمھیں صرف ایک کپ چائے کے پیسے ہی اپنے ساتھ لانے ہوں گے۔"

"بالکل ٹھیک۔ بہر حال ہم دونوں دوست ہیں۔" میں نے جواب میں کہا۔

"ہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔"

اور اس نے چابک سے گھوڑے کو بہت آہستہ سے چھوا اور تانگہ کھڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ بنسی کی آواز گھوڑے کی چال کے ساتھ ساتھ نکل رہی تھی۔

'آیا' بیڈ روم میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اس کے پھیلے ہوئے کولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔ یہ ایک طوفان کی علامت تھی۔

"تم مجھے بتائے بغیر اس طرح بازار کیسے چلے گئے؟" اس نے غصہ سے کہا۔ (کیا دادی ماں سے اجازت لینا کافی نہیں ہے)۔ "میں اس وقت سے تمھیں نہلانے کے

025
www.taemeernews.com



لیے انتظار کر رہی ہوں۔"

"اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب نہیں!" میں نے پُر امید ہو کر کہا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ لنچ میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔ تم اپنے کپڑے اتارو۔"

کپڑے اتارتے وقت آیا نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ بنسی تانگہ والے کے ساتھ مت رہا کرو۔ میں نے سوچا کہ شاید اسے کچھ حسد پیدا ہو گئی ہے۔

"وہ ایک دھوکہ باز، شرابی، جواری آدمی ہے اور چرس وغیرہ بھی پیتا ہے۔ ٹی۔ بی کے علاوہ اسے کئی اور بھی خطرناک بیماریاں ہیں۔ اس طرح کے لوگوں سے دوستی نہیں کرنا چاہیے۔ 'بابا' سمجھ گئے نا؟"

میں نے ہاں میں اپنا سر ہلایا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔

میں نے سوچا کہ یہ ہمیشہ لوگوں کے بارے میں ایسے ہی کہتی رہتی ہے اور میرا تانگہ پر بغیر کچھ دیے سواری کرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

میرے والد بتایا کرتے تھے کہ دہرہ دون میں بہت اچھے اچھے درخت ہیں۔ دادی ماں کے گھر کے چاروں طرف نیم، آم، شریفے، پپیتے اور پرانے پیپل کے درخت ہیں۔ ان میں سے کچھ درخت میرے دادا اور دادی نے لگائے تھے۔

میں نے دادی ماں سے پوچھا: "شریفے کا پیڑ کتنا پرانا ہے؟"

"مجھے سوچنے دو۔" دادی ماں نے کہا اور شریفہ کے درخت کو بہت غور سے دیکھنے کے بعد انھیں یاد آیا۔ "ہاں یہ درخت تمھارے دادا نے 1927 میں لگایا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور 14 جولائی 1927 کو ہم نے تمھارے والد کا جنم دن پیڑ لگا کر منایا تھا۔ تمھاری پیدائش سے بہت پہلے کی بات ہے۔"

ہمارے گھر کے پیچھے جو برگد کا پیڑ اگا ہوا ہے، اس کی شاخیں پھیل کر زمین تک پہنچ گئی ہیں اور ان شاخوں نے دوبارہ زمین میں جڑ پکڑ لی ہے اور لہراتے ہوئے راستوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان کے درمیان مجھے گھومنا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ درخت اس گھر سے اور ہمارے آباء واجداد سے بھی پرانا ہے۔ اتنا پرانا جتنا دہرہ دون۔

026
www.taemeernews.com



میں اس درخت کی ہری اور گھنی پتیوں کے پیچھے چھپ کر دنیا کا نظارہ کر سکتا ہوں۔

تقریباً ساٹھ فٹ لمبے اس بلند و بالا درخت کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ میں نے اتنا بڑا درخت اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں آہستہ آہستہ بڑی احتیاط کے ساتھ اس کی طرف بڑھا مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ درخت میری دوستی قبول کرے گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ اس کی شاخوں سے حرکات و سکنات کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن یہ آوازیں کہاں سے اور کس طرح آ رہی تھیں اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

درخت سے ایک پتا گرا جو دوستی کی ابتدا کی علامت تھا۔

وہ پتا میرے چہرے سے رگڑ کھاتا ہوا زمین پر گرتا اس سے پہلے ہی میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے اپنی انگلیوں اور گھومتے ہوئے چمکدار اور چکنے پتے کو غور سے دیکھا اور اپنے ہاتھ سے پیڑ کی کھردری چھال کو چھوا تو بہت اچھا لگا۔ پھر میں نے پیڑ پر چڑھنے کے لیے اس طرح جوتے اور موزے اتارے جیسے کسی مقدس جگہ میں داخل ہوتے وقت اتارے جاتے ہیں۔ اس پھیلے ہوئے پیڑ کے تنے پر پہلے میں نے اپنا پیر جمایا اس کے بعد اسے ہاتھ سے پکڑ لیا اور پھر میں نے اوپر تک پھیلی ہوئی پیڑ کی جڑوں کی مدد سے اوپر کی طرف چڑھنے کی کوشش کی۔

مجھے محسوس ہوا کہ پیڑ پر چڑھنے میں کوئی ہاتھ میری مدد کر رہا ہے لیکن کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پیڑ میں کوئی روحانی ہاتھ ہے جس نے مجھے چھوا اور اوپر چڑھنے میں میری مدد کی۔

پیڑ سے مجھے اپنائیت کا احساس ہوتا تھا لیکن کچھ ایسی بھی چیزیں تھیں جنھیں میرے وہاں آنے پر پریشانی ہوئی۔ پیڑ کے سوراخ سے طوطے کا ایک جوڑا چہچہاتا ہوا باغ سے باہر نکل گیا جس کو دیکھ کر لال، ہرے اور سنہری جیسے شوخ رنگ دکھائی دیے۔ ایک گلہری نے پیڑ کی شاخ کے پیچھے سے مجھے دیکھا اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے رینگتی ہوئی اپنے ساتھیوں کو بتانے واپس چلی گئی۔

میں پیڑ کے اوپر کی طرف بڑھا۔ میرے سر کے ٹھیک اوپر ایک چڑیا کی سرخی

027
www.taemeernews.com



مائل چونچ نظر آئی لیکن اس نے مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ وہ اس پیڑ کے تنے کے ایک بڑے سوراخ میں آرام کر رہی تھی۔ اس سوراخ سے چڑیا کی لمبی چونچ اور سر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بڑی بوریت کے انداز میں میری طرف دیکھا۔ وہ کبھی آنکھیں کھولتی اور پھر بند کر لیتی، اس طرح وہ اونگھ رہی تھی۔

میں نے خود سے کہا: "یہاں تو بہت سے کیڑے مکوڑے رہتے ہیں لیکن وہ خطرناک نہیں ہیں۔"

اسی لمحہ ایک جھینگر وہاں سے گزرا جس سے چڑیا پھڑ پھڑانے لگی۔ چونچ اور پیڑ کا تنا زور سے ٹکرائے جس سے ٹک کی آواز نکلی۔

میں گھبراہٹ میں گر جاتا لیکن اس مضبوط پیڑ سے گرنا آسان نہیں تھا کیونکہ اس میں جگہ جگہ رکنے اور لیٹنے کی بھی جگہیں تھیں۔ میں اس شاخ کی مدد سے رینگتا ہوا سوراخ سے آگے بڑھ گیا اور پیڑ کا خاص حصہ جو گھنا اور ٹھنڈا تھا آہستہ آہستہ اس سے آگے بڑھ کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں سورج کی کرنیں پتوں سے چھن کر نیچے آ رہی تھیں۔

میں پھیلی ہوئی شاخوں کے پتوں کی چادر کے پیچھے چھپ کر سیدھا لیٹ گیا۔ وہاں سے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک صاحب کیپ لگائے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ان کی بیوی ایک شوخ چھتری کو تیزی سے گھماتی ہوئی دکھائی دیں۔ بظاہر چھتری لگانے کا مقصد واضح تھا کہ کہیں ان کا رنگ کالا نہ پڑ جائے اور وہ غلطی سے غیر ملکی دکھائی نہ دینے لگیں۔ ان کے پیچھے ایک بچہ گاڑی اور نوکرانی تھی۔

اس کے علاوہ بہت سے ہندستانی بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ دھوتی پہنے تھے اور کچھ لنگوٹی اور کچھ یورپی لباس میں ملبوس تھے اور کچھ لوگوں کا سامان قلی اٹھائے ہوئے تھے۔

سڑک پر اچانک دھول مٹی اور ہارن کی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی بے قابو اژدہا آ رہا ہو لیکن وہ مارِس کی نئی ماڈل کی ٹورنگ کار تھی۔ اس کے پیچھے سائیکل سوار، اس کے بعد پیتے والا اپنے سر پر ٹوکری لیے ہوئے تھا، پھر تماشا دکھانے والا دکھائی دیا

028
www.taemeernews.com



جس کے ہاتھ میں ایک ڈھول تھا۔ تماشا دکھانے والے کے ساتھ ایک بندر تھا اور بہت سے بچے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ بندر جھلملاتے ہوئے کپڑے اور بچے کی طرح ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ کھڑکھڑاتا ہوا بنسی کا تانگہ روڈ پر آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے آواز دی اور وہ حیرت سے اوپر برگد کے پیڑ کی شاخوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"اوپر تم کیا کر رہے ہو؟" بنسی نے چلا کر پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ "دادی ماں سے چھپ کر یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"اور تانگے کی سواری کب کرو گے؟"

میں نے جواباً کہا۔ "منگل کے دن دوپہر کے بعد۔"

"آج کیوں نہیں؟"

"آیا آج مجھے نہیں چھوڑے گی اور منگل کے دن اس کی چھٹی ہوتی ہے۔"

بنسی نے پان کی پیک سڑک پر تھوکتے ہوئے کہا۔ "آیا تم سے جلتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے جواب میں کہا۔ "عورتیں ہمیشہ جلتی ہیں، شاید اس لیے کہ اس کے پاس تانگہ نہیں ہے۔"

بنسی نے بڑی بدمزاجی سے کہا: "اس لیے کہ آیا کے پاس اچھا تانگہ چلانے والا بھی نہیں ہے۔ تم فکر مت کرو۔ میں منگل کے دن یعنی پرسوں آؤں گا۔ بس کل ہی کی تو بات ہے۔"

میں نے بنسی کو سر ہلاتے ہوئے اشارہ کیا اور اسی شاخ پر واپس چلا گیا کیونکہ کچھ فاصلے پر آیا کی آواز سنائی دی تھی۔ بنسی نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور چٹاخ کی آواز کرتے ہوئے تانگے کو تیزی سے بھگا لے گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں گھر آیا تو آیا نے پوچھا: "تم اوپر کیا کر رہے تھے؟"

میں نے جواب میں بتایا کہ سڑک کے دوسری طرف سانپ دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس بات پر زیادہ بحث نہیں کرے گی۔ اسے اس بات پر تعجب ہوگا کہ میں نے صرف ایک سانپ دیکھا کیونکہ کاٹھیاواڑ میں دہرہ دون سے زیادہ سانپ پائے جاتے ہیں۔

اس نے پوچھا: "وہ تمھارے قریب آ رہا تھا یا واپس جا رہا تھا۔"

029
www.taemeernews.com



"وہ واپس جا رہا تھا۔"

یہ سن کر آیا کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

"سانپ کو واپس جاتے ہوئے دیکھنا غریبی کی علامت ہے۔" اس نے بڑے اداس لہجہ میں کہا۔

اس نے اچانک میرے پیٹ کی طرف قریب سے دیکھتے ہوئے کہا : "تم بہت خوش قسمت ہو!"

"کیسے!" میں نے اس سے کہا "ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ تم غریب ہی رہو گے، کیونکہ تم نے سانپ کو غلط راستہ پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"نہیں، تم بہت زمانے تک غریب نہیں رہ سکتے کیونکہ تمھارے پیٹ پر ایک تل ہے جو خوش قسمتی کی علامت ہے۔ ایک تل تمھارے بازو کے نیچے ہے۔ اس کا مطلب ہے تمھیں بہت شہرت ملے گی۔ کیا تمھاری ناک پر بھی تل ہے۔ نہیں، خدا کا شکر ہے۔ ناک پر تل ہونا قاتل ہونے کی علامت ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا : "کیا تمھارے بھی کوئی تل ہے؟"

آیا نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سر ہلایا اور کندھے سے آستین کو اوپر کر کے بازو پر ایک بڑا تل دکھایا۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

آیا نے بڑے مایوس کن لہجہ میں کہا۔ "اس کا مطلب مصائب و آلام کی زندگی۔"

میں نے اس سے پوچھا : "کیا میں اس تل کو چھو سکتا ہوں؟"

اس نے کہا : "ہاں چھو سکتے ہو" اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس تل پر رکھ دیا۔

"یہ بہت اچھا تل ہے۔" میں نے آیا کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ "کیا میں اس کا بوسہ لے سکتا ہوں۔"

آیا نے کہا۔ "تم اس تل کا بوسہ لے سکتے ہو۔"

030
www.taemeernews.com



میں نے اس تِل کا بوسہ لیا۔

اس نے کہا : ''مجھے بہت اچھا لگا۔''

آخر کار منگل کا دن آ ہی گیا۔ دوپہر کے بعد جیسے ہی دادی ماں سو گئیں اور آیا بازار چلی گئی، میں فوراً دروازے پر آ گیا اور سڑک پر اوپر نیچے بنسی اور اس کے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے آنے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ تانگہ کے سڑک کی طرف مڑتے ہی میں نے بنسی کے گانے کی آواز سن لی۔ وہ تانگہ کے ساتھ سُر ملا کر گا رہا تھا۔

وہ تانگے سے نیچے اترا اور میرا ہاتھ پکڑ کر جھکولے دیتا ہوا تانگے کے قریب لے گیا اور اگلی سیٹ پر اپنے پاس مجھے بٹھا لیا۔

سڑک سے نیچے کی طرف اترتے وقت لڑکھڑاتے ہوئے تانگے کو میں نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ جب ہم شہر سے ذرا باہر آئے تو بنسی نے گھوڑے کو ایک مخصوص آواز کے ساتھ اور تیز چلنے کے لیے اکسایا اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر آگے کی طرف جھکتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر چابک پٹاخ سے مارا۔ اس کے بعد ہم تیز رفتاری سے سڑک کے ایک طرف آ گئے اور سڑک کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ جھٹکا لگنے سے میں بنسی کی بانہوں سے چمٹ گیا۔ بنسی کا منہ پان کی سرخ پیک سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

''ہم کہاں جائیں گے، دوست!'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''کسی بھی جگہ، کہیں بھی۔''

بنسی نے کہا۔ ''ندی پر چلتے ہیں۔''

یہ ندی جو حقیقت میں جھرنے کا ایک خوبصورت پہاڑ دکھائی دیتی ہے، دہرہ دون کے جنگلوں سے گزرتی ہوئی پندرہ کلو میٹر دور جا کر گنگا ندی میں جا ملتی ہے۔ گرمی کی ابتدا اور جاڑے کے موسم میں تو تقریباً خشک ہو جاتی ہے لیکن برسات میں تو اس میں باڑھ آ جاتی ہے۔

دہرہ دون کے باہری علاقے کی صاف ستھری اور ڈھلوان سڑکوں پر ہمارا تانگہ تیز دوڑ رہا تھا۔ راستے میں چائے کے باغات اور سفیدے کے درخت لگے ہوئے

031
www.taemeernews.com



تھے۔ گھوڑے کے دھات کے کھر جب سڑک سے ٹکراتے تو چنگاری پیدا ہو جاتی تھی۔ تانگے کے پہیوں کے چڑچڑ کی آواز سے مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی پہیہ نکل گیا تو ہم کسی کھڈے میں جا پڑیں گے یا پھر سڑک کے ساتھ بہتی ہوئی نہر میں جا گریں گے۔ ہمارا تانگہ تیزی کے ساتھ آم، امرود، لیچی اور دیگر پھلدار درختوں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ سال اور شیشم کے درخت بھی تیزی سے گزرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک بنسی نے تانگہ کو ایک کھردری پگڈنڈی کی طرف موڑ لیا۔ تقریباً ایک فرلانگ تک نیچے کی طرف چلنے کے بعد ہم ایک جھرنے پر پہنچ گئے۔

بنسی نے کہا۔ ''میں، تم اور گھوڑا تینوں ہی چلو سیدھے پانی میں چلتے ہیں''۔ اس نے تانگے کو جھرنے کے بیچ میں لے جا کر کھڑا کر دیا اور گھوڑے کے گھٹنے پانی میں ڈوب گئے۔

''میں بھی نہانے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں بلکہ گھوڑا بھی نہانا چاہتا ہے۔'' بنسی نے کہا۔ ''مالک کی طرح گھوڑا بھی نہا کر کیوں نہ خوشی محسوس کرے؟'' یہ کہہ کر بنسی نے اپنے کپڑے اتار کر پھینکے اور پانی میں کود پڑا۔

نل کے مقابلے میں جھرنے پر نہانا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اس نے اپنے سینے پر اور پھر ران پر ہاتھ مار کر چلاتے ہوئے کہا ''آؤ دوست تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔''

تھوڑی دیر ہچکچاہٹ کے بعد میں اس کی طرف چل پڑا لیکن پانی میں ہیر رکھتے ہی مجھے ایک کرنٹ محسوس ہوا اور میں گھوڑے کی دم پکڑ کر پانی کے اندر چلا گیا۔ بنسی گھوڑے کی پیٹھ پر پانی اچھالنے لگا۔

اس کے بعد بنسی، مجھے اور گھوڑے کو ندی کے باہر لے آیا اور ہم دونوں نے مل کر تانگے کو اچھی طرح سے دھویا۔ کیونکہ مجھے لمبے سفر کے لیے ایک صاف ستھری مفت کی سواری ملی ہوئی تھی اور بنسی کو مدد کرنے کے لیے ایک مفت کا آدمی ملا ہوا تھا۔ تانگے کو دھونے کے بعد اس نے مجھے آم پاپڑ کا ایک پیکٹ دیا جو ایک چپچپی ٹافی کی طرح آم کے گودے سے بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس طرح پھاڑا جیسے کتا گوشت کو پھاڑتا ہے۔ اس کے بعد مجھے سستی محسوس ہوئی اور میں سورج کی روشنی سے چمکتی ہوئی گر

032
www.taemeernews.com



گھاس پر لیٹ گیا۔ جھینگر اور دوسرے کیڑے مکوڑے پیڑوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے اپنی آوازیں ایک دوسرے تک پہنچا رہے تھے۔ نیل کنٹھ کا ایک جوڑا سر کے اوپر بڑی چابک دستی سے چکر لگا رہا تھا۔

بنسی کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اس نے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"تین بج چکے ہیں۔ تمھاری آیا، تمھارے گھر کب آئے گی؟ وہ تمھاری دادی ماں سے زیادہ خطرناک لگتی ہے!"

"وہ چار بجے آجاتی ہے۔"

"ہمیں بہت جلد واپس جانا ہوگا۔ انھیں مت بتانا کہ ہم کہاں گئے تھے۔ نہیں تو میں تمھارے گھر کبھی دوبارہ نہیں آسکوں گا اور تمھاری دادی ماں میری بہترین گراہک ہیں۔"

"ان کے مرنے پر تمھیں بہت افسوس ہوگا۔"

"یقیناً، میرے دوست۔"

بنسی نے تیزی کے ساتھ تانگہ کو شہر کی طرف دوڑایا۔ ان دنوں بیل گاڑی اور تانگوں وغیرہ کی تعداد موٹروں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔

آیا کے آنے سے پانچ منٹ پہلے ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ بنسی نے جانے سے پہلے یہ وعدہ کیا کہ وہ اگلے ہفتہ مجھے تانگے کی سواری پھر کرائے گا۔

دہرہ دون کا گھر بک چکا تھا۔ میرے والد نے کوئی اثاثہ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ان دنوں ملیریا بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ وہ یہ بات نہیں سمجھ سکے اور بہت جلد ان کی صحت ملیریا کے بخار کی وجہ سے گرتی گئی۔ انتقال سے پہلے بھی وہ مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اب میرے والد دنیا میں نہیں رہے۔ ہندستان میں دادی ماں کے ٹھہرنے کے لیے کوئی ٹھکانہ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ بینک میں بھی کوئی پیسہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ انگلینڈ جانے کے لیے انھیں پیسوں کی سخت ضرورت تھی اور مجبوراً انھوں نے گھر بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر گھوش جو ان دنوں دہرہ دون کے ایک

033
www.taemeernews.com



کامیاب ڈاکٹر تھے، انھوں نے دادی ماں کو اس مکان کے لیے معقول رقم دینے کی پیش کش کی جو انھوں نے منظور کرلی۔

حالات تیزی سے بدلتے گئے۔ دادی ماں نے گھر کا زیادہ تر سامان بیچ دیا کیونکہ ان کے لیے یہ سامان لے جانا بہت مشکل تھا۔ ایک کباڑی گھومتا ہوا آیا اور اس نے کراکری، فرنیچر، کارپیٹ اور گھنٹہ وغیرہ بہت کم قیمت میں خرید لیا، لیکن دادی ماں کا کچھ پسندیدہ سامان بھی تھا جسے وہ بیچنا نہیں چاہتی تھیں۔ مثلاً لکڑی کے فریم والا آئینہ، اخروٹ کی لکڑی سے بنی آرام کرسی اور گلاب کی لکڑی سے بنی ہوئی لکھنے پڑھنے کی میز وغیرہ۔ ان سب چیزوں کو بیل گاڑی کے بغیر ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔

آیا کو ہمارے جانے کا پہلے تو بہت افسوس ہوا لیکن بعد میں اسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ دادی ماں نے آسام میں چائے کے باغات رکھنے والے ایک گھرانے میں اس کو نوکری دلادی ہے لیکن اس شرط پر کہ دہرہ دون چھوڑنے تک وہ انھیں کے ساتھ کام کرے گی۔

ستمبر کے آخر میں ہم دہرہ دون سے روانہ ہوئے اور تب ہی آسمان میں بادل گھر آئے اور چاروں طرف پھیل گئے اور بھینی بھینی ہواؤں کے ساتھ ہمالیہ کی پہاڑیوں سے نیچے اترنے لگے۔ میں اور میرے والد نے مل کر جہاں درختوں کے پودے لگائے تھے، انھیں دوبارہ دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ سفر کی تیاری اور جلد بازی میں اتنا جذباتی ہو گیا کہ پیپل کے پیڑ کے نیچے کے گڈھے میں سے اپنا چھوٹا سا اثاثہ جس میں لٹو، غلیل اور صلیب شامل تھی لینا بھول گیا اور وہ اس وقت یاد آیا جب ہم بنسی کے تانگے میں بیٹھ چکے تھے اور اسٹیشن جارہے تھے۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی واپس جانے کا مطلب تھا کہ گاڑی چھوٹ جاتی۔

"جلدی کرو!" دادی ماں نے گھبرا کر کہا۔ "بنسی ہمیں جلدی پہنچنا چاہیے۔"

بنسی گھوڑے کی راسیں کستے ہوئے زور سے چلایا۔

"ہے ہے" اور گھوڑے کی رفتار تیز ہو گئی۔

"نو بجنے میں پانچ منٹ ہیں۔" انھوں نے کہا۔ "اور گاڑی نو بجے چلی

034
www.taemeernews.com



جاتی ہے۔"

"فکر مت کرو میم صاحب، میں تمھیں پندرہ سال سے اسٹیشن لے جا رہا ہوں۔ کیا کبھی تمھاری گاڑی چھوٹی۔"

"نہیں۔" دادی ماں نے جواب دیا۔ "بنسی شاید اب کبھی دوبارہ تم مجھے اسٹیشن نہیں لے جاپاؤ گے۔"

"وقت بدل رہا ہے، میم صاحب آپ کو نہیں معلوم کہ اب دہرہ دون میں تانگے کے مقابلے میں ٹیکسی اور کاریں چلنے لگی ہیں؟ آپ خوش قسمت ہیں کہ یہاں سے جا رہی ہیں۔ اگر آپ یہیں رہتیں تو مجھے بھوک سے مرتا ہوا دیکھتیں۔"

"اگر گاڑی چھوٹ گئی تو ہم سب ہی بھوک سے مر جائیں گے۔"

"فکر مت کیجیے یہ بات سب جانتے ہیں کہ گاڑی کبھی وقت پر نہیں چھوٹتی اور اگر وہ واقعی نو بجے نکل جائے تو کوئی بھی گاڑی نہیں پکڑ پائے گا۔"

بنسی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہم لوگ نو بج کر پانچ منٹ پر گاڑی پکڑنے کے لیے اسٹیشن پر پہنچے لیکن گاڑی ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اسٹیشن پر بہت بھیڑ تھی۔ کچھ لوگ گاڑی کا انتظار کر رہے تھے اور کچھ لوگ ان سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ 'آیا' پہلے سے وہاں کھڑی ہوئی بکھرے ہوئے سامان کے ڈھیر کی حفاظت کر رہی تھی۔ ہم پلیٹ فارم پر اپنے بکسوں پر بیٹھ گئے اور ہندستانی ریلوے اسٹیشن کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے۔ پسینے میں شرابور قلی، ریڑھی پر میگزین بیچنے والے، مٹھائی اور لڈو بیچنے والے، بستروں اور سامان کے بیچ ادھر ادھر پریشان حال گھوم رہے تھے۔ مختلف لوگ، آوارہ کتے اور کبھی کبھار اسٹیشن ماسٹر بھی بھٹکتا ہوا دکھائی دیتا۔ پھیری والوں کی آوازیں چائے گرما گرم چائے، مٹھائی، پاپڑ، گرم سموسے، دانتوں کا منجن، کیلے، غبارے، فلمی ستاروں کی تصویریں، لکڑی کے کھلونے، چکنی مٹی کی بنی ہوئی بھگوان کی مورتیاں اور ٹھنڈا بیچنے والوں کی آوزیں یارڈ میں جاتے ہوئے اسٹیم انجن کے شور و غل میں مل گئی تھیں اور اسٹیشن ایک بازار بن کر رہ گیا تھا۔

آیا مجھے ہر طرح سے باخبر کر رہی تھی۔

035
www.taemeernews.com



"دیکھو' بابا' چلتی ہوئی گاڑی سے سر کھڑکی سے باہر مت نکالنا۔ پچھلے سال ایک امریکن لڑکے کا سر کٹ گیا تھا! یہاں سے بمبئی تک اسٹیشن پر الٹی سیدھی چیزیں مت کھانا۔ کوئی اجنبی آدمی کمپارٹمنٹ میں نہ گھسے۔ پچھلے سال مسٹر ولکنس کو لوٹ کر ان کا قتل کر دیا گیا تھا۔"

گھنٹی بجی اور دور سے چھک چھک کرتا ہوا ابرے، کالے اور سنہرے رنگ کا اسٹیم انجن آتا ہوا دکھائی دیا اور ہمیشہ کے مطابق ایک آوارہ کتا گاڑی کے سامنے سے ریلوے لائن سے کود کر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کھلے، کھڑکیوں کے شٹر گرے اور لوگوں کے چہرے دکھائی دینے۔ گاڑی رکنے سے پہلے ہی لوگ اندر گھسنے اور باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ چند لمحوں کے لیے نظام درہم برہم ہو گیا۔ بھیڑ میں لوگ طوفان کی طرح کبھی آگے کی طرف بھاگتے اور کبھی پیچھے کی طرف۔ نہ کوئی گاڑی کے اندر گھس پا رہا تھا اور نہ ہی کوئی باہر نکل پا رہا تھا۔ سو لوگ اگر اتر رہے تھے تو دو سو لوگ گھسنا چاہتے تھے۔ کوئی راستہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ ایک آدمی کے کھڑکی کے راستے سے باہر آنے پر کچھ مسئلہ ہوا۔ دوسرے لوگ بھی اس کی دیکھا دیکھی کھڑکی سے باہر نکلنے لگے۔ اس طرح دروازوں پر دباؤ کچھ کم ہوا اور لوگ بھینچ کر ڈبوں میں داخل ہونے شروع ہوئے۔

بنسی اور آدھا درجن قلیوں کی مدد سے دادی ماں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں گھس کر فوراً ہی اپنی ریزرو برتھ پر بیٹھ گئیں۔ ہم لوگ بھی جلدی سے سامان لے کر اس ڈبے میں داخل ہو گئے۔ زوردار سیٹی کی آواز سنائی دی اور گاڑی چل پڑی۔ بنسی چلتی ہوئی گاڑی سے کود گیا۔

انجن کی رفتار تیز ہوتے ہی میں 'آیا' کی ہدایت کو بھول گیا اور اپنا سر کھڑکی کے باہر نکال کر گزرتے ہوئے پلیٹ فارم کو دیکھنے لگا۔ 'آیا' اور بنسی ہاتھ ہلا رہے تھے اور میں بھی انھیں دیکھ کر اس وقت تک ہاتھ ہلاتا رہا جب تک گاڑی اندھیرے میں نہیں چلی گئی۔ دہرہ دون کی روشنیاں مدھم ہو گئیں اور دیہاتوں کی بجھتی ہوئی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ تارے بھی صاف دکھائی دینے لگے۔ مجھے ایک تیز رفتار ٹوٹا تارا

036
www.taemeernews.com



جنت سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے یاد آیا کہ 'آیا' نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ ان تاروں میں نیک لوگوں کی روحیں بسی ہوتی ہیں۔ ٹوٹے تارے میں اپنے والد کی روح کو محسوس کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہماری روانگی کے بارے میں انھیں معلوم ہے۔ کیا وہ اس سفر میں ہمارے ساتھ ہوں گے۔ تب ہی مجھے 'آیا' کی بتائی ہوئی ایک اور بات یاد آئی۔ ٹوٹے تارے کو دیکھ کر اگر کوئی اسی وقت اپنی پانچوں انگلیوں کو منہ کے اندر ڈال کر کوئی دعا مانگے تو اس کی دعا ضرور قبول ہو گی!

اس حال میں دیکھ کر دادی ماں نے مجھ سے پوچھا : "اگر تم تاروں میں کھوئے ہوئے ہو تو زمین پر کیا کر رہے ہو؟"

"دعا مانگ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ!" دادی ماں بولیں۔

پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ اس کے بعد نہ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا اور نہ میں نے انھیں کچھ بتایا۔

www.taemeernews.com

# کلپسو کرسمس

لندن میں میرا پہلا کرسمس تھا اور اس موقع پر میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ سوئٹس کا ٹیج کے پاس میرا چھوٹا سا کمرہ تھا جو بہت ٹھنڈا رہتا تھا۔ میری مکان مالک نے کسی طرح کے شور شرابے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میرے پاس سنیما دیکھنے یا کسی اچھے ریسٹورنٹ جانے کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ میں گیس کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ٹوسٹ اور پھلیاں کھاتے ہوئے سستی سی شراب پی کر اپنا پہلا انگلش کرسمس کا دن مناتے ہوئے اپنا وقت گزار رہا تھا اور ہندستانی دوستوں کے بھیجے ہوئے کرسمس کارڈ جو انگیٹھی کے حاشیہ پر لٹکے ہوئے تھے انھیں دیکھ کر مجھے تسلی ہو رہی تھی۔

لیکن اگلے سال میرے حالات بہتر ہو گئے۔ میں نے زیادہ پیسہ کمایا اور ایک اچھے کشادہ اور صاف ستھرے کمرے میں رہنے لگا۔ نئی مکان مالک نے میرے دوستوں اور یہاں تک کہ لڑکیوں کو بھی گھر میں آنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ میرے لیے آلو بخارے کی بنی ہوئی کھیر (پڈنگ) بھی بنا دیتی تھی جس سے میں اپنے دوستوں کی خاطر کر سکوں۔ میرے دوستوں میں ہندستانی اور کامن ویلتھ سے آئے ہوئے طلبا بھی شامل تھے۔ انھیں کے ذریعہ میں جارج سے ملا جو نہایت ہی حساس اور انسان دوست تھا اور ترینیداد کا رہنے والا تھا۔

جارج طالب علم نہیں تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ ہزاروں

038
www.taemeernews.com



دوسرے ویسٹ انڈینز کی طرح وہ بھی انگلینڈ آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہاں پر نوکریوں کی کمی نہیں ہے اور سرکار کی طرف سے دوائیوں اور بیمہ وغیرہ کا مفت انتظام ہے۔ یہاں وہ ایک ہفتہ میں دس سے بارہ پونڈ تک کما سکتا ہے، جبکہ ترینیداد اور جمائیکا میں اتنا نہیں کما سکتا۔ یہ بات سچ تھی کہ انگلینڈ میں نوکریاں بہت تھیں لیکن اس سچائی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقامی مزدور باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو نوکری دینے پر اعتراض کرتے تھے۔ لیکن ان آنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اقلیت میں تھے اور پس ماندہ تھے اور انھیں نوکری کی ضرورت تھی اور وہ اپنی محنت اور جفاکشی کے ذریعہ اپنی پہچان بنا سکتے تھے۔

بہرحال باہر سے آئے ہوئے لوگ لندن میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے تھے لیکن ویسٹ انڈینز سورج نکلتے ہی شور شرابے اور گانے بجانے کے عادی تھے جبکہ لندن میں ایسا رواج نہیں تھا۔

سردی کے موسم میں لندن کے لوگ سبز مائل اور دھندلے رنگ سے ملتے جلتے کپڑے پہنتے تھے جو دھند اور بارش کے موسم میں آرام دہ ہوتے تھے۔ لندن کے لوگ گہرے رنگوں کو ظلم کی نشانی تصور کرتے تھے۔ وہ پُرسکون زندگی کے عادی تھے۔ انھیں کسی طرح کا شور وغل پسند نہیں تھا۔ اس کے برخلاف ویسٹ انڈینز شوخ مزاج تھے اور گانے بجانے اور شور شرابے کے بہت شوقین تھے۔ اکثر ان کے گھروں پر پارٹیوں کا اہتمام ہوتا رہتا تھا اور وہ انگلینڈ کو اپنا ہی ملک تصور کرنے لگے تھے۔ وہ بارش، دھند یا کسی بھی موسم میں اس طرح رہتے تھے جیسے وہ اپنے ملک ترینیداد میں رہا کرتے تھے۔

جارج برٹش ریلوے کے ایک زمین دوز اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر تھا اور اسے یہ کام پسند بھی تھا۔ اس کام کے ایک ہفتے میں اسے تقریباً دس پونڈ مل جایا کرتے تھے۔ وہ لمبا چوڑا لحیم شحیم موٹے ہاتھ پیروں والا شریف انسان تھا جس کے جنبش کرتے ہوئے چہرے سے ہمیشہ خوش نما تاثرات نمایاں ہوتے تھے۔ دوسرے ساتھیوں کی طرح وہ بھی پیانو بجانے کا بہت شوقین تھا۔ میرے کمرے میں ایک پرانا بوسیدہ پیانو تھا۔ وہ اکثر

039
www.taemeernews.com



شام کے وقت اپنی موٹی انگلیوں سے اس کے بٹن کو دبایا کرتا تھا جس کی بے سری آواز چاروں طرف پھیل جاتی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ کرسمس منایا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا:
"میری مکان مالک نے پڈنگ بنائی ہے۔ ایک شراب کی بوتل بھی رکھی ہوئی ہے۔ کیا تم اس میں شامل ہو سکتے ہو؟"

مجھے معلوم تھا کہ جارج کو مدعو کرنے کا مطلب ہے کہ اس کے دوست احباب اور رشتہ داروں کے علاوہ ترینیداد میں رہنے والا کوئی اور بھی اس کے ساتھ آسکتا ہے۔

کرسمس کے دن ٹھیک آٹھ بجے Hampstead Heath کے نیچے سے آنے والی ٹھنڈی ہوا خاموش پتوں کو ہلا رہی تھی۔ جارج کی قیادت میں ویسٹ انڈیز کی مختلف قسم کی فوج بلیا ئزا یونیو کے نیچے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔

میں نے حیرت انگیز انداز میں ان کے لیے دروازہ کھولا۔ جارج کے ساتھ اس کے بھائی، بھتیجے اور دوست وغیرہ مسکراتے ہوئے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے اور میرے کمرے کی تعریف کرتے ہوئے داخل ہوئے اور بولے : "کیا بہترین پیانو ہے۔ اس انوکھی تصویر کو دیکھو اور یہ کرسی تو ہمیں حیرت میں ڈال رہی ہے۔"

اور بلا تکلف وہ اپنے گھر کی طرح محسوس کرنے لگے۔ اس تقریب کے لیے ہر ایک کچھ نہ کچھ تحفہ ساتھ لایا تھا۔ جارج کے پاس بہت سی بیئر کی بوتلیں تھیں۔ ایرک جو سانولے رنگ کا ایک نوجوان تھا بہت سی سگریٹ اور بیئر کی بوتلیں لایا تھا۔ ماریہ، جو گداز جسم والی پینتیس سالہ خاتون تھی اس نے میرے کمرے داخل ہوتے ہی میرے گلابی گالوں کی تعریف کی اور بوسہ دیا۔ وہ اپنے ساتھ سور کا خشک گوشت اور انڈے لائی تھی۔ اس کی سولہ سال کی بیٹی لوسی جو عنفوانِ شباب میں تھی، گراموفون لے کر آئی تھی جبکہ اس کا بھتیجہ کچھ رکارڈز لایا تھا۔ دوسرے دوست احباب بھی اپنے ساتھ بیئر لائے تھے۔ ایک من چلے دوست نے زمیں قند شراب کی ایک بوتل پیش کی۔

040
www.taemeernews.com



اس کے بعد سب لوگ ایک ساتھ مل کر جشن منانے لگے۔ لوسی نے گراموفون پر "بیس اسٹریٹ بلیوز" کا رکارڈ لگادیا اور پورا کمرہ گانے کی آواز سے گونج اٹھا اور جارج پیانو بجا کر گانے کا ساتھ دینے لگا۔ اس کی موٹی موٹی انگلیاں پیانو کے بٹنوں پر زور زور سے پڑ رہی تھیں۔ ماریا گیس اسٹوو جلا کر بیکون اور انڈے تلنے میں مصروف ہو گئی۔ ادھر ایرک، بیئر کی بوتل کھول رہا تھا۔ اس شور و غل کے دوران دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ دروازہ کھولنے پر وہاں مالک مکان موجود تھی۔

کمرے پر چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے اس نے کہا "مسٹر بونڈ! کچھ پڑوس کا بھی خیال کرو۔" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "آج کرسمس کے تہوار کی وجہ سے یہ سب لوگ یہاں جمع ہیں۔ لیکن ایک گھنٹہ میں واپس چلے جائیں گے۔"

وہ سر جھٹکتی بڑبڑاتی ورانڈے سے ہوتی ہوئی واپس نیچے چلی گئی اور میں نے کمرے کی کھڑکیوں کو بند کر کے ان پر پردے ڈال دیے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ پڑوسیوں تک اس شور شرابے کی آواز نہیں جائے گی اور وہ سوچیں گے کہ شاید ہم سنیما دیکھنے چلے گئے ہیں۔ جارج نے پیانو بجانا شروع کر دیا۔ ایرک اور لوسی کمرے میں ڈانس کرنے لگے اور ان کے دونوں بھتیجے بھی اس میں شامل ہو گئے۔ تب ہی اچانک ماریہ مجھے بانہوں میں کس کر "کلپسو میوزک" سکھانے لگی۔ اس وقت گراموفون پر "بنانا بوٹ سانگ" بج رہا تھا۔

اس طرح پارٹی کو ختم ہونے میں تین گھنٹے لگ گئے، جبکہ یہ پارٹی ایک گھنٹہ میں ختم ہونی تھی۔ ہم لوگوں نے ساری شراب پی لی اور خوب انڈے کھائے۔ میں نے ماریہ، لوسی اور ان کے دونوں بھتیجوں کے ساتھ خوب ڈانس کیا۔ ڈانس کرتے کرتے وہ لوگ اچانک جوش میں چیخ پڑتے "فائر"؟ میں بھی ان کے ساتھ انجانے میں یہ کہہ کر چیخ پڑتا "فائر۔" اس لفظ میں ایک عجیب قسم کا جوش بھرا ہوا تھا۔

وہ سب بہت پیارے اور اچھے دوست تھے اور انھوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ کرسمس پارٹی میں شرکت کی اور اسے ایک یادگار کرسمس پارٹی بنا دیا۔

آہ مجھے آج بھی جارج، ماریا، لوسی اور ایرک کے چہرے یاد ہیں۔

041
www.taemeernews.com



آدھی رات ہو چکی تھی اور میں لوسی کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا کہ اچانک لائٹ چلی گئی اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا اور لوسی نے مجھے بوسہ دیا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو خوش قسمت محسوس کر رہا تھا۔

آدھی رات ہو چکی تھی۔ بس یا کسی دوسری سواری کا انتظام بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ سب لوگ ایک ساتھ گروپ کی شکل میں ہائی وے گولڈن گرین تک پیدل ہی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد چاروں طرف سناٹا چھا گیا، صرف میری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ اس لیے مجھے سردی کا احساس ہونے لگا۔ گلی کے دوسرے گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور چاروں طرف سناٹا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے صرف ہم لوگوں نے ہی کرسمس منایا ہے۔

www.taemeernews.com

# دہلی کا آخری سفر

میرے پاس کئی برس سے ایک نیگیٹیو پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے فوٹو بنوانے کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ دراصل یہ میری نانی کی تصویر تھی۔

مجھے اپنی نانی اچھی طرح یاد ہیں کیونکہ ان کے بیوہ ہونے کے بعد میرا زیادہ تر بچپن دہرہ دون میں انھیں کے ساتھ گزرا تھا اور سبھی لوگ بتاتے ہیں کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ سخت مزاج اور تنہائی پسند تھیں اور میں ان سے کچھ کچھ ڈرتا بھی تھا۔

خاندان کے اور لوگوں کی تصویریں میرے پاس نہیں تھیں، بس یہ ایک نیگیٹیو ہی تھا جو بہت دنوں سے پڑا ہوا تھا اور جس پر دھبے پڑ گئے تھے۔

پچھلے ہفتہ میں اپنی ماں سے ملنے گیا تھا جو دہلی کے ایک ہسپتال میں داخل تھیں اور وہ اپنے آپریشن کا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے اپنی ماں سے نانی کے بارے میں بات کی اور اس نیگیٹیو کے بارے میں بتایا اور میں نے طے کیا کہ اس کا ایک فوٹو اپنی والدہ کے لیے ضرور بنواؤں گا۔

میں نے فوٹو میں پچیس سال بعد پہلی بار ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یہ فوٹو میری والدہ سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ میں بھی ان کی طرح ایک کمرے میں خوشی سے سادہ زندگی گزارتا اور وہ بھی اپنے کمرے میں رہنا پسند کرتی تھیں۔ باقی حصہ میں گھر کے

043
www.taemeernews.com



دوسرے لوگ رہتے تھے اور میں بھی ان کی طرح اپنے کام میں مصروف رہتا تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ جسمانی اعتبار سے میری ماں سے زیادہ مجھ سے مشابہت رکھتی ہیں۔ بالکل میری طرح ان کے خوبصورت بال، بھرا ہوا جسم، اونچا ماتھا تھا۔

فوٹو میں وہ برآمدے کی اونچی سیڑھی پر کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور میرے نانا ان کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ ان پر آم کے درخت کا سایہ پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ تصویر میں واضح نہیں تھا۔ لیکن اس کے پتوں کا سایہ دیوار پر بھی پڑ رہا تھا جس کی بناوٹ سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ آم کا درخت ہے۔

میرے نانا پتلے دبلے لیکن صاف ستھرے انسان تھے۔ ان کے چہرے پر نیچے کی طرف جھکی ہوئی مونچھیں تھیں جو بیسویں صدی میں فیشن سمجھی جاتی تھیں۔ مگر وہ تصویر میں اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ ان کا رنگ کالا تھا، کپڑے بھی اچھے نہیں پہنتے تھے۔ ان کے چلنے کا انداز سڑک پر سامان بیچنے والے کسی دکاندار کی طرح تھا۔ میری ماں نے بتایا کہ وہ ایک مرتبہ میری نانی کو بھی اب سنتروں کی ایک ٹوکری بیچ آئے تھے۔ میری نانی میں ملکہ وکٹوریہ کی طرح شائستگی تھی اور وہ مضبوط شخصیت رکھتی تھیں لیکن میرے نانا ان کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط تھے۔ لیکن دونوں میں اچھا تال میل تھا۔

لیکن میں یہ تصویر اپنی والدہ کو دکھانا چاہتا تھا جن کا لیڈی ہارڈنگ ہسپتال میں آپریشن ہونے والا ہے اور جو اپنے بائیں چھاتی کے کٹنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

اگست کی ابتدا تھی۔ موسم میں بڑی خشکی اور اُمس تھا۔ رات میں کچھ بارش ہوئی تھی۔ لیکن اب سورج نکل آیا تھا۔ میری شرٹ پسینے سے چپک رہی تھی۔ میں ایک چھوٹی سی ٹیکسی میں پیچھے کی طرف بیٹھ گیا جو نئی دہلی کے علاقہ کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

سڑک کے کنارے خوشحال پنجابیوں کے گھر دکھائی دے رہے تھے جو 1947 میں ہجرت کر کے دہلی آئے تھے اور اب راجدھانی میں آدھے سے زیادہ آبادی انھیں لوگوں کی تھی۔ یہ محنتی، صحت مند اور ترقی یافتہ تھے۔ تیس سال پہلے سڑک کے

044
www.taemeernews.com



دونوں جانب جہاں تک نظر جاتی تھی میدان دکھائی دیتا تھا۔ اراولی پہاڑیوں کا نچلا سپاٹ حصہ رِج کہلاتا تھا، جہاں دور تک پھیلے ہوئے جنگل میں کالے ہرن گھومتے تھے۔ اس ویران جنگل میں فیروز شاہ کی (چودھویں صدی) شکار گاہ تھی جو آج بھی موجود ہے مگر یہ پٹرول پمپ بننے کی وجہ سے اب دکھائی نہیں دیتی اور کاروں، بسوں، ٹرکوں اور اسکوٹروں کی آوازوں میں غائب ہو گئی ہے۔ مور جنگل سے اڑ گئے اور کالے ہرن بھی غائب ہو گئے ہیں۔ صرف گیدڑ باقی رہ گئے ہیں۔ ہماری زمین دوسرے سیاروں کے لیے تصوراتی دنیا ہے۔ آج سے ہزاروں سال بعد جب انسانی زندگی ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد کوّے اور گیدڑ ضرور باقی رہ جائیں گے۔

ہسپتال کے اندر داخل ہونا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ تقریباً ایک میل پہلے ہی سے پنچ کوئیاں روڈ کا فٹ پاتھ چائے والوں اور فرنیچر کی دکانوں کے سامان کے ڈھیر سے گھرا ہوا تھا۔ گیٹ کے پاس ہی ایک پانی کا نل لگا ہوا تھا جس سے گندہ پانی سڑک پر بہہ رہا تھا۔

میری ماں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھیں جو ٹھنڈا تھا لیکن اس میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور چھت کا پنکھا گھوم رہا تھا۔ جنوبی ہند کی ایک سانولی سی نرس میری ماں کی تیمارداری کر رہی تھی۔ وہ چشم زدن میں اٹھی اور اس نے چارٹ پر ایک نشان لگا دیا۔

میری ماں نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ ان کے گال بخار اور حرارت سے تمتمارہے تھے۔ وہ بالکل فکرمند نہیں تھیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کل کا آپریشن انھیں صرف ایک سال کی زندگی اور دے سکتا ہے۔ میں ان کے بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گیا۔ جرمنی سے واپس آنے کے بعد میں ان سے تیسری بار مل رہا تھا۔ میری تمام جمع جوڑ ختم ہو چکی تھی اور میں آپریشن کے بعد ہمیشہ کے لیے واپس چلا جانا چاہتا تھا مگر یہ پہاڑ مجھے ہمیشہ بلاتے رہیں گے۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ کل میرا آپریشن کریں گے اور انھوں

045
www.taemeernews.com



نے سگریٹ پینے کے لیے منع کیا ہے۔"

"کیا آپ رم پی سکتی ہیں؟"

"نہیں۔ آپریشن کے کچھ دن بعد تک بھی نہیں!"

چون سال کی عمر میں ان کے بال کافی حد تک سفید ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے چہرے پر کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہی چھوٹا سا منہ اور تھوڑی اور چمکیلی آنکھیں۔ ان کے چہرے میں اپنی والدہ سے زیادہ اپنے والد سے مشابہت تھی۔ نرس کے جانے کے بعد میں نے وہ فوٹو ماں کے ہاتھ دے دیا۔

"اتنے برسوں سے یہ نیگیٹیو میرے پاس تھا مگر میں نے یہ فوٹو کل ہی بنوایا ہے۔"

"میں چشمہ کے بغیر نہیں دیکھ سکتی۔"

چشمہ ان کے بیڈ کے پاس لاکر پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے چشمہ اٹھا کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انھوں نے چشمہ آنکھوں پر لگایا اور فوٹو کو غور سے دیکھنے لگیں۔

"تمھاری نانی تم سے بہت محبت کرتی تھیں۔"

"واقعتاً وہ ایک شائستہ خاتون تھیں۔"

"جب تم نے تعلیم مکمل کی تھی تو انھوں نے جرمنی جانے کے لیے تمھارے لیے کچھ رقم دی تھی۔ وہ بہت زیادہ تو نہیں تھی لیکن ٹکٹ کے لیے کافی تھی۔ انھوں نے کچھ تو تمھارے لیے چھوڑا تھا لیکن میں نے تمھارے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔"

"تم جانتی ہو کہ میں نے پیسے کی کبھی پروا نہیں کی میرے والد نے مجھے لکھنا ھنا سکھایا اور یہی میرا ورثہ ہے۔"

"میں نے تمھیں کچھ بھی نہیں سکھایا۔"

"شاید تمھیں نے مجھے زندگی میں خوش رہنا سکھایا۔"

"میں نے پریشانیوں میں بھی اپنے آپ کو خوش رکھا لیکن تمھارے باپ ھی بھی خوش نہیں رہے۔ اس لیے ہم دونوں میں خوب جھگڑا ہوتا تھا اور آخر کار ہم

046
www.taemeernews.com



علیحدہ ہو گئے۔"

"وہ آپ سے عمر میں بڑے تھے۔"

"تم نے ہمیشہ مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے تمھارے والد کو چھوڑا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے۔"

"میں اس وقت بہت چھوٹا تھا اور تم اچانک مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ میرے والد نے میری نگہداشت کی جو ان کے لیے مشکل کام تھا۔ وہ بیمار بھی رہتے تھے۔ ان حالات میں میں آپ کو ہی برا کہتا تھا۔"

"تمھارا باپ مجھے تم سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔"

"کیونکہ تم کسی دوسرے شخص سے شادی کرنے جا رہی تھیں۔"

"میں نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا : "ہم اس سلسلے میں پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔ میں اپنے والد کی طرف سے وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ الزام تراشی کا وقت گزر چکا ہے۔"

باہر بارش شروع ہو گئی۔ کھلے ہوئے دروازے سے گیلی مٹی کی خوشبو اندر آئی جس میں دوائیوں اور جراثیم وغیرہ کی بو بھی شامل تھی۔ کالی آنکھوں والی نرس دوبارہ آئی اور اس نے بتایا کہ ڈاکٹر جلد ہی راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔ میں نے اپنی ماں سے کہا کہ میں شام کو دوبارہ آؤں گا یا پھر صبح آپریشن سے پہلے آجاؤں گا۔

میری ماں نے کہا کہ شام ہی کو آجانا کیونکہ اس وقت دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے۔

"میں دوسروں سے ملنے نہیں آیا ہوں۔"

"وہ تم سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔"

'وہ' میرے سوتیلے باپ اور سوتیلے بھائی تھے۔

"میں ان سے صبح میں ملاقات کر لوں گا۔"

"جیسے تمھاری مرضی۔۔۔"

اور اب میں دوبارہ واپس آکر سڑک کے پاس فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔

047
www.taemeernews.com



گاڑیوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایسا لگ رہا تھا کہ ہر گاڑی والا اپنے پاس والی گاڑی سے آگے نکل جانے کی کوشش میں ہے۔ ہارن کی آوازیں ہسپتال کے کوری ڈور کے اندر ہی سے سنائی دینا شروع ہو گئی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہر آدمی کو شور و غل کی عادت ہو گئی ہے اور کوئی بھی اس کی پروا نہیں کر رہا تھا۔ بیمار اور غیر صحت مند لوگوں کو یہ سوچ کر تسلی ہوتی ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو دوسروں کی تکلیف کی پروا نہیں کرتے۔ دہلی میں ہر آدمی کو لمبی قطاروں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی خواہش رہتی ہے اور وہ کسی بھی چیز کو سب سے پہلے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ کوئی بھی ایک دوسرے سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر ایک اسکوٹر رکشا کو روکا جو کچھ فاصلے پر آکر رُکا۔ کسی نے مجھے ہاتھ سے پیچھے کیا اور خود اسکوٹر رکشا میں بیٹھ گیا۔ اس طرح کے طور طریقے تو کسی ''دہلی والے'' کے ہی ہو سکتے ہیں۔

میں پھر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر کسی دوسرے اسکوٹر کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر ہو گئی مگر کوئی اسکوٹر وہاں سے نہیں گزرا۔

دہلی میں جو دوسرے نمبر پر آجاتا ہے وہ آخر نمبر پر پہنچ جاتا ہے۔

میں اپنے چھوٹے سے ہوٹل کی طرف پیدل ہی واپس چل پڑا اور میں راستے ہی میں یہ سوچتا ہوا چل رہا تھا کہ کہیں میں نے اپنی ماں کے آخری دیدار تو نہیں کیے۔

www.taemeernews.com

# وہ بھی کیا دن تھے

مِس میکینزی کو میں نے مالابار کی سارڈین کا ایک ڈبہ تحفہ میں پیش کیا جس سے ان کے غصہ کی ترشی میں کمی واقع ہو گئی۔

ایک اور ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اس نے چشمے کی آڑ سے میری طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھا اور میں اس وقت ادھ مرا سا ہو گیا۔۔۔

مِس میکینزی کی عمر پچاس سال تھی لیکن اسے دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ مر جائے گی۔ وہ اس پہاڑی علاقے کی سب سے پرانی رہنے والی تھی۔ اس کا ایک چھوٹا سا گھر پہاڑی کے راستہ میں تھا۔ اس کا گھر اتری گاؤں میں بنے ہوئے لانگ فیلو کے گھر کی طرح تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا ہے۔ لیکن وہ پہاڑی کے آدھے راستہ پر ہی ختم ہو جاتا تھا اور وہ راستہ کے کنارے پر لگے ہوئے میپل اور اوک کے پیڑوں سے چھپا ہوا تھا۔

میں نے مِس میکینزی سے کہا : "میں پندرہ دن کے لیے دہلی جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس دوران ٹھیک ہی رہو گی۔"

مِس میکینزی سے میری نہ تو کوئی رشتہ داری تھی اور نہ کوئی پرانی دوستی لیکن مِس میکینزی میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کو اپنا بنا کر ان میں اپنے تئیں ذمہ داری کا احساس پیدا کر دیتی تھی۔

049
www.taemeernews.com



"مجھے گلہ نہیں ہے۔ اور ہاں، پادری نے مجھے کچھ انڈے بھجوائے ہیں۔"

کھانے پینے کی چیزیں جو اسے ملتی تھیں وہ اسے اپنے بڑے اسٹور میں رکھ لیتی تھی۔ اس کی پینشن صرف چالیس روپے ماہانہ تھی، جس سے اس کی دال روٹی ہی چل سکتی تھی۔ جو لوگ اسے جانتے تھے وقتاً فوقتاً انگلینڈ سے کھانے کی مختلف چیزیں پارسل کی شکل میں تحفے کے طور پر بھیجتے تھے، جس سے اسے باتیں کرنے کا بھی ایک موضوع مل جاتا تھا۔

میں نے کہا: "مجھے خوشی ہے کہ تمھارے پاس انڈے ہیں۔"

"یہ اب چار روپے درجن ہیں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ ایک وقت تھا کہ جب چھ آنے میں ایک درجن انڈے ملتے تھے۔"

"غالباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔"

"نہیں پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تب مے ٹیلر کے انڈوں کو بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ راجا کے محل کے پاس فینز نامی ایک پرانا مکان تھا وہ اسی میں رہتی تھیں۔"

"کیا ان کا پولٹری فارم بھی تھا؟"

"ارے نہیں ان کی اپنی پالتو مرغیاں تھیں، وہ بھی معمولی نسل کی۔ وہ مرغیاں سفید یا Rhode Island Red تھیں مگر انڈے خوب دیتی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ مرغیوں کو صحت مند کس طرح رکھا جا سکتا ہے۔۔۔ مے ٹیلر میری ایک اچھی دوست تھی۔ تم جانتے ہو کہ وہ سب کو انڈے نہیں بیچتی تھی۔"

"نہیں نہیں۔ ظاہر ہے۔ شاید مس ٹیلر کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں، مر گئی ہیں۔"

"اوہ! مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوا؟"

"یہ بھی ایک راز کی بات ہے۔ دراصل 'مے' اور شارلٹ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ ایک ساتھ رہنے پر کیسے راضی ہو گئیں۔

050
www.taemeernews.com



وہ بچپن میں لڑا کرتی تھیں۔ شارلٹ تو پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھی لیکن خوبصورت تھی۔ مے کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کی عمر پینتیس سال تھی۔ وہ ایک اچھی عورت تھی، میرا مطلب ہے کہ وہ گھر میں رہتی تھی، کھانا بناتی اور باعزت لوگوں کی طرح چرچ جایا کرتی تھی۔ اسے سب ہی لوگ پسند کرتے تھے۔ لیکن شارلٹ کا برتاؤ اچھا نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی رہتی تھی۔ والدین کی موت کے بعد تو وہ تھوڑی شراب بھی پینے لگی تھی۔"

"ان دونوں میں سے کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی؟"

"نہیں ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ شاید وہ اس وجہ سے ساتھ رہتی تھیں۔"

"حالانکہ میں بھی اکیلی تھی۔ لیکن مجھے کسی کے ساتھ رہنا پسند نہیں تھا۔"

"وہ دونوں بہنیں تھیں۔ لیکن دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ شارلٹ اپنی جوانی میں بڑی خوبصورت اور منچلی ہوا کرتی تھی۔ فوجیوں میں اس کے بہت چرچے تھے۔ اس زمانے میں شادی کے لیے اس کے بہت سے رشتے آئے۔ لیکن وہ تیار نہیں تھی۔ اور جب اس نے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو زیادہ رشتے نہیں تھے۔ تب اس کی عمر پینتیس سال ہو چکی تھی۔ اس نے بہت زیادہ شراب پینا شروع کر دی تھی۔ جس میں برانڈی اور جن وغیرہ شامل تھی جو ان دنوں سستی تھی اور شاید دو روپے کی بوتل تھی۔"

"عجیب مذاق ہے کہ میں ایک نسل کے بعد پیدا ہوا۔"

"یہ ایک اچھی بات بھی ہے ورنہ شاید تمھارا خاتمہ بھی چارلوٹے کی طرح ہوتا۔"

"کیا وہ کبھی کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوئی تھی؟"

"نہیں اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا لیکن شارلٹ کے ایسے ہی سخت اصول تھے جیسے آپ کے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں کچھ شراب لے سکتا ہوں؟"

اس نے مجھے ایک پُر معنی نگاہوں سے دیکھا اور شراب پیش کی۔

"کیا تم نے کبھی ٹیلر کے ساتھ شراب پی؟"

051
www.taemeernews.com



"کبھی نہیں! میں اس کے ساتھ کسی محفل میں نہیں رہا۔ جب وہ شراب پی لیتی تھی تو اسے اچھے برے کی پہچان ختم ہو جاتی تھی۔ وہ ایک نائی کے ساتھ بھی چلی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ تو شام کو کھڈ میں گر گئی جس سے اس کا ٹخنہ ٹوٹ گیا۔"

"وہ خوش قسمت ہے کہ اس کا سر نہیں ٹوٹا۔"

"اس کا اپنا سر نہیں ٹوٹا مگر۔ اس نے بیچاری اپنی بہن کا سر ضرور پھوڑ دیا۔"

"اس نے اپنی بہن کا سر پھوڑ دیا! نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی۔" مجھے اس بات پر کچھ شک ہوا۔

"کسی کو نہیں معلوم کہ کیا بات تھی۔ لیکن کچھ ایسی ویسی ہی بات ہو گی۔ بہر حال ایک دن ان دونوں میں بہت جھگڑا ہوا۔ شارلٹ شراب میں دھت تھی اور مے ہمیشہ کی طرح اسے نصیحت کر رہی تھی۔"

"شرابی کو کبھی نصیحت نہیں کرنی چاہیے۔"

مس میکینزی نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔ اس نے کہا کہ شارلٹ کے سر پر جو چوٹ لگی، وہ خدا کی طرف سے بھی ایک پریشانی ہو سکتی ہے۔ مگر کیا مے کا سر ہی چوٹ لگنے کے لیے رہ گیا تھا۔ شارلٹ طیش میں آ گئی اور چیخ پڑی اور اس نے مے کے سر پر کوئی بھاری چیز مار دی۔ یہ کیا چیز تھی شارلٹ نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں نے زمین پر پڑے ہوئے ٹکڑوں کو صاف کر دیا۔ شاید یہ وہی بھاری چیز تھی جس کو ادیبوں نے کٹھلا ہتھیار کا نام دیا ہے۔

دو دن کے بعد جب چارلوٹے کو ہوش آیا تو اس نے سوچا کہ میں نے یہ سب کچھ کیا کر دیا۔ اس کے چاروں طرف چیزیں بکھری پڑی تھیں اور دیوانگی کی کیفیت میں بڑبڑا رہی تھی کہ اگر مے میرے ساتھ چپکی ہوئی نہ رہتی تو بہت پہلے ہی میری شادی ہو چکی ہوتی۔

"کیا اس پر قتل کا الزام لگایا گیا؟"

"نہیں! کیس دبا دیا گیا اور شارلٹ کو رانچی کے پاگل خانے میں بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ مے کو یہیں پر دفن کر دیا گیا۔ اگر تمہارا کبھی

052
www.taemeernews.com



قبرستان جانا ہو تو دیکھنا کہ دوسری قطار میں بائیں طرف سے اس کی تیسری قبر ہے۔ میں کبھی کبھی وہاں جاتی ہوں۔ جو بھی ان دونوں بہنوں کے بارے میں جانتا ہے، اسے شدید صدمہ پہنچتا ہے۔

"میں بہت مایوس رہتی ہوں کیونکہ مے سے مجھے بہت لگاؤ تھا۔ اس کی مرغیاں تو بیچ دی گئیں اور اب مجھے انڈے دوسری جگہ سے خریدنا پڑتے ہیں۔ لیکن وہ اتنے اچھے نہیں ہوتے۔ بہر حال وہ دن بہت اچھے دن تھے جب انڈے چھ آنے درجن اور جن کی بوتل صرف ایک روپے میں مل جاتی تھی۔"

www.taemeernews.com

# اور بینا چلی گئی

ایک دن کا ذکر ہے میں سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں سے ہو کر گزر رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک لڑکی کے گانے کی آواز سنائی دی۔

پہاڑوں پر گرمی کا موسم تھا۔ درختوں پر نئی پتیاں نکل آئی تھیں۔ ان پتوں میں اخروٹ اور چیری کے پھل پکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ہوا بالکل بند تھی اور پیڑ اپنی جگہ جامد و ساکت کھڑے ہوئے تھے۔ لفظ تو سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن گانے کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ اس سریلے نغمے کے اتار چڑھاؤ نے مجھے اس آواز کا گرویدہ بنا دیا۔ آواز یقیناً کسی معصوم نوجوان کی تھی۔

میں نے اپنا راستہ چھوڑ دیا اور گھٹنوں کے بل ڈھلان کی طرف چیڑ کے تنوں پر پھسلتا ہوا بالکل نیچے جا پہنچا۔ لیکن وہاں تو نہ گانے کی آواز سنائی دی اور نہ وہاں پر کوئی دکھائی دیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا، شاید مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ پہاڑوں پر عموماً اس طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔

میں اپنے گھر کی طرف واپس چل پڑا مگر تب ہی مجھے گانے کی ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ میٹھی اور سریلی آواز پیڑوں کے گہرے اندھیرے میں سے آرہی تھی۔

054
www.taemeernews.com



میں اپنے بارے میں سوچنے لگا کہ ابھی تک بجلی کا بل جمع نہیں ہوا اور بینک میں کچھ بھی نہیں ہے اور میرا دوسرا ناول کسی اور ناشر کے پاس جانے کے لیے تیار ہے۔ لیکن ابھی گرمی بہت تھی۔ انسان اور جانور سب گرمی سے اونگھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ مجھ سے قرض لینے والے لوگ بھی سست پڑ گئے تھے۔ دور دراز کے پہاڑ بے رنگ اور گرد و غبار کی وجہ سے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

میں چیڑ کے درختوں میں ایک بار پھر داخل ہوا لیکن اس بار بھی مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک میں اپنے کاٹیج ہی میں رہا۔ میں نے ناول کو دوبارہ لکھا تھا اور اس پر بہت سخت محنت کی تھی۔ صرف کھانا کھانے اور سونے کے لیے ہی اٹھتا اور ان پتوں سے نوٹ لیتا جو بکھرے ہرے ہوتے جا رہے تھے۔

کھڑکی جنگل کی طرف کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے پاس شاہ بلوط، اوک، میپل، اخروٹ کے درخت لگے ہوئے تھے۔ پہاڑ کی اونچائی سے چیڑ کے پیڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اس سے آگے پہاڑی پر دیودار کے درختوں کی فوج مارچ کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پیڑوں کی قطاریں دور تک چھوٹی چھوٹی دکھائی دیتی رہیں اور آخر میں دکھائی دینا بند ہو گئیں۔ اس کے بعد ابھرتی ہوئی کالی چٹانیں دکھائی دیں جو برف سے جا ملتی تھیں۔ ان اونچائیوں کو آسمان کا پالنا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ منظر کھڑکی سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ صبح کے صاف ستھرے ماحول میں ٹہری روڈ سے اس منظر کو دیکھا جا سکتا تھا۔

پہاڑی کی تہہ میں ایک جھرنا تھا۔ ایک دن صبح سویرے گھسے ہوئے گول پتھروں پر قدم رکھتا ہوا تقریباً آدھا کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے نیچے جھرنے پر پہنچا اور چیڑ کے درخت کے سائے میں ایک سیدھی چٹان پر لیٹ کر پیڑ کی شاخوں سے چھنتی ہوئی سورج کی روشنی کو دیکھنے لگا جو ایک اونچی پہاڑی (پری ٹبا) سے ہوتی ہوئی وادی میں آ رہی تھی۔

ہوا رکی ہوئی تھی اور چڑیاں پہلے سے خاموش تھیں۔ جھرنے کے پتھریلے بستر پر پانی کے بہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں وہاں پر دس یا شاید پندرہ منٹ تک

055
www.taemeernews.com



لیٹا رہا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ کوئی مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی مجھے پیڑوں کے سائے سے تھما ہوا، رُکا ہوا دیکھ رہا ہے۔ سب کچھ بے حس و حرکت تھا۔ ایک پتھر بھی نہیں ہلا، پیڑ کی شاخ بھی نہیں ڈولی۔ میں ذرا تو نہیں لیکن محسوس کیا کہ کوئی اجنبی آنکھیں مجھے چھپ کر ضرور دیکھ رہی ہیں۔ بہر حال اس چٹان سے ہٹ کر میں نے ایک الگ راستہ تلاش کیا اور پیڑوں سے ہوتا ہوا اس پہاڑی پر واپس آگیا جہاں سے چلا تھا۔

سورج پورے عروج پر تھا۔ سخت گرمی تھی اور ہوا بھی بند تھی۔ پہاڑی پر پہنچنے تک میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ مگر مجھے دیکھنے والے کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ دو مریل سی گائیں گھاس چر رہی تھیں۔ اس گرم موسم میں صرف گائے کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اپنی کھڑکی سے ایک بار پھر وہی آواز سنی بالکل وہی آواز اور گانے والی بھی ضرور وہی تھی۔ میں جو کتاب پڑھ رہا تھا اسے ایک طرف رکھا اور کھڑکی سے جھک کر نیچے پیڑوں کی طرف دیکھا لیکن گھنے پتوں میں کچھ دکھائی نہیں دیا اور گانے والی بھی اتنی دور تھی کہ وہاں تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ میں نے سوچا کہ کیا مجھے اس سے ملنے جانا چاہیے؟ اس کو دیکھنے سے بہتر ہے کہ اس کی آواز سنی جائے کیونکہ میں نے آواز سے محبت کی ہے گانے والی سے نہیں۔ یقیناً مجھے گانے نے نہیں آواز ہی نے اپیل کی ہے۔۔۔ آخر کار آواز آنا بند ہو گئی اور میں کھڑکی سے واپس چلا آیا۔

ایک لڑکی پہاڑی کے پاس رس بھری جمع کر رہی تھی۔ خوبصورت رنگ، تازہ چہرہ، اس کے شیشے کی طرح چمکتے ہوئے ہونٹوں میں ارغوانی رنگ جھلک رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ "کیا یہ پھل کھانے میں اچھے ہوتے ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے اپنی مٹھی کھولی اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ اس کی مٹھی میں بہت سی مسلی ہوئی رس بھریاں تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک اٹھائی اور منہ میں ڈال لی۔ اس کا مزا بہت تیکھا اور کھٹا تھا۔ "اس کا مزا اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ میں اس کی زبان بہت مشکل سے اور رک کر بول رہا تھا۔ اس نے میرے قریب آکر کہا کہ اور لے لو اور

056
www.taemeernews.com



میرے ہاتھ میں بہت سی رس بھریاں بھر دیں۔ اس کی انگلیوں نے مجھے چھو لیا۔ یہ عجیب قسم کا احساس تھا۔ غالباً ایسا نویں یا دسویں بار ہوا تھا کہ میرا ہاتھ کسی لڑکی نے چھوا ہو۔

"تم کہاں رہتی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے وادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا: "پہاڑ کی ڈھلان پر وہ کھڑا ہوا ایک گاؤں ہے۔ وہیں میں رہتی ہوں۔"

"وہ تو بہت دور ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ہمیشہ اتنی دور سے آتی ہو؟"

"میں واپس بھی اتنی ہی دور جاتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "گائے کو تازہ گھاس چاہیے۔ کچھ لکڑیاں جمع کرنی ہوتی ہیں اور گھاس وغیرہ کاٹنی ہوتی ہے۔" اور اس نے اپنے کمر میں کپڑے سے بندھی ہوئی درانتی دکھائی۔ "کبھی میں پری ٹبا جاتی ہوں اور کبھی کبھار اس وادی کے پیچھے۔ آپ کبھی ادھر گئے ہیں؟"

"نہیں میں وہاں نہیں گیا لیکن کسی دن جاؤں گا۔"

"پری ٹبا پر ہمیشہ ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ وہاں پر پریاں رہتی ہیں؟"

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "یہ تو لوگ کہتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو کبھی وہاں پر نہیں گئے۔"

"یہ کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کے غاروں میں بھوت پریت رہتے ہیں۔ لیکن میں نے تو آج تک کچھ نہیں دیکھا۔"

"بھوتوں کے بارے میں سنا تو ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ سچ کہانی ہے کہ دو پریمیوں نے بھاگ کر اس پہاڑی کی گپھاؤ میں پناہ لی تھی۔ بجلی اور طوفان میں ان کی موت ہو گئی تھی۔"

"میں نے یہ کہانی سنی ہے لیکن یہ میرے پیدا ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ اب پری ٹبا پر بھوت پریت نہیں رہتے۔"

"تمھاری عمر کتنی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

057
www.taemeernews.com



''مجھے یاد تو نہیں ہے لیکن یہی پندرہ سولہ سال ہو گی۔''

''کیا تمھاری ماں کو بھی نہیں معلوم؟''

''ان کا انتقال ہو چکا ہے اور میری دادی کو کچھ یاد نہیں ہے۔ میرا بھائی مجھ سے بہت چھوٹا ہے۔ اس کو بھی اپنی عمر یاد نہیں۔ کیا عمر یاد رکھنا ضروری ہے؟''

''نہیں، ضروری نہیں ہے اور یہاں پر، بہر حال پہاڑوں اور چٹانوں پر سو سال بھی ایک دن کی طرح لگتے ہیں۔''

''تم تو بوڑھے ہو۔'' اس نے کہا۔

''میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ کیا میں تمھیں بوڑھا لگتا ہوں؟ کیا ہو گی میری عمر؟''

اس نے کہا ''سو سال'' اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے ہاتھ کو منہ پر رکھ لیا۔ اس کی کلائی میں چاندی کی چوڑیاں چمک رہی تھیں۔

''تم کیوں ہنس رہی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کیونکہ تمھیں دیکھنے سے ایسا لگ رہا ہے کہ تم میری بات پر یقین کر رہے ہو۔ تمھاری عمر کیا ہے؟''

''مجھے یاد نہیں، پینتیس یا چھتیس سال ہو گی۔''

''بھول جانا ہی اچھا ہے!''

''ہاں یہ سچ ہے۔'' میں نے جوب دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن فارم بھرتے وقت ایسی چیزیں مثلاً عمر وغیرہ صحیح لکھنا پڑتی ہیں۔''

''میں نے کبھی فارم نہیں بھرا اور فارم صرف کاغذ کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس میں بیکار کی باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ یہ صرف انسانی ترقی کا ایک حصہ ہے۔''

''ترقی؟

''ہاں، کیا تم خوش نہیں ہو نیں؟''

''نہیں۔''

''کیا تمھیں غصہ آگیا؟''

''نہیں۔''

058
www.taemeernews.com



"کیا تمھیں ترقی کرنا اچھا نہیں لگتا؟ جنگلی رس بھری ہی اچھی ہے۔"

اور وہ بغیر سلام کیے ہوئے چلی گئی۔ گائیں ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں اور وہ انھیں نیلو بھوری کہتی ہوئی ننگے نازک پیروں سے چٹان اور گھاس پر دوڑ رہی تھی۔

مئی کی ابتدا تھی۔ جھینگر جنگل میں گا رہے تھے۔ وہ اپنی ٹانگوں کے ذریعہ ناچ کر آواز بھی نکال رہے تھے بلکہ وہ پیڑوں کی اونچائیوں پر ایک دوسرے کی آوازوں کا جواب دیتے ہوئے بازیگرانہ انداز میں اڑان بھی بھر رہے تھے۔ کبھی کبھی لنگور بھی اوک کے پیڑ پر پتیاں کھانے آجاتے۔ جیسے ہی میں جھرنے کی طرف بڑھا میں نے بالکل وہی آواز سنی جو آج مجھے پانی کے کنارے واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو چٹان پر بیٹھے ہوئے دیکھا جو چلتے ہوئے تیز پانی میں اپنے پیر ڈالے ہوئے بیٹھی تھی۔ وہ لڑکی جس نے مجھے بہت سارے رس بھری کے پھل دیے تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ گلوکارہ ہے۔ اجنبی آواز سن کر میرے ذہن میں تخیلاتی شکلیں مثلاً لڑکی، ایک پری، نرم و نازک خوبصورت دیوی کی طرح کی معصوم آنکھیں، گول دودھیا چہرہ، پتلی دبلی، اس کی دھوتی کھردری سی، گھریلو ساڑی پھٹی ہوئی۔ وہ بے کار سے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پہاڑوں پر چلنے کی وجہ سے گاؤں کے لوگ اپنی لڑکیوں کو بارہ سال کی عمر تک دھوتی پہناتے ہیں۔ لڑکی نے لٹکے ہوئے کپڑے کو مضبوطی کے ساتھ کس کر کمر سے باندھا اور جھالردار اسکرٹ پہن لیا تاکہ پہاڑیوں پر دور تک جانے میں آسانی ہو جائے۔

لیکن میرے ذہن سے اس کے نقش ہٹے نہیں تھے اور میرے تخیل میں اس کا معصوم اور کھلکھلاتا ہوا چہرہ موجود تھا۔ اس کی سریلی آواز سے اور بھی دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے اسے جھرنے کے کنارے سے دیکھا۔ اس وقت وہ اوپر یعنی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھسیا گئی اور اس نے اپنی جیبھ نکال کر مجھے چڑایا۔ یہ بہترین طریقہ تھا مجھے مبارکباد دینے کا۔ میں نے سوچا۔ کیا میں نے اس کے دل کو کوئی ٹھیس پہنچائی ہے؟

059
www.taemeernews.com



''تم نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ بلایا کیوں نہیں؟'' اس نے میرے قریب آکر کہا۔

''کیونکہ میں تمھارا گانا سن رہا تھا اور گانا ختم ہونے تک تم سے بات نہیں کر سکتا تھا۔''

''وہ تو صرف ایک گیت تھا۔''

''لیکن وہ تم نے بہت سریلی آواز میں گایا تھا۔''

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم کچھ کھانے کے لیے لائے ہو؟''

''نہیں تو۔ کیا تمھیں بھوک لگ رہی ہے؟''

''ہاں، مجھے بھوک تو لگ رہی ہے۔'' اس نے مزید کہا۔

''جب بھی تم مجھ سے ملنے آؤ کچھ نہ کچھ ہمیشہ میرے لیے کھانے کو ضرور لایا کرنا۔''

''لیکن میں تم سے ملنے نہیں آؤں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم یہاں پر ملو گی بھی یا نہیں۔''

''تم مجھ سے ملنا نہیں چاہو گے؟''

''میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن تم سے ملنا اچھا لگتا ہے۔''

''میں تمھیں ہمیشہ جنگل ہی میں ملوں گی لیکن میرے کھانے کے لیے ہمیشہ ضرور لایا کرنا۔''

''آئندہ ایسا ہی کروں گا۔ کیا میں تمھارے لیے رس بھری کے پھل لا سکتا ہوں؟''

''آئندہ جب آپ دوبارہ پہاڑ کی چوٹی پر جائیں گے تو وہاں تمھیں گنگورا کی جھاڑیاں ملیں گی۔''

''یہ سب کچھ میں نہیں جانتا اگر بھوک لگی ہے تو میں کچھ تمھارے لیے کھانے کو لاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ لیکن جب میری نگاہ اس کے پیروں کی

060
www.taemeernews.com



طرف گئی تو وہ اس وقت بھی پانی میں پڑے ہوئے تھے۔

ایک بار پھر 'تائنٹ ایرنٹ' کی طرح میں دوبارہ بڑی مشقت اور جانفشانی کے ساتھ اس وقت تک پہاڑی پر چڑھتا رہا جب تک میں رس بھری کی جھاڑیوں تک نہیں پہنچ گیا اور رس بھری کے پھلوں کو اپنی جیب میں نہیں ٹھونس لیا۔ لیکن جب جھرنے کی طرف واپس آیا تو وہ وہاں سے جا چکی تھی اور دور پہاڑی پر بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اندھیری رات کے سناٹے میں جگنو چمک رہے تھے۔ جھینگر، ہرن، کانٹے دار چوہے اور پتنگوں کی آوازیں کھڑکی کے دروازوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وادی کے اس پار پہاڑی پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں جھلملاتی ہوئی روشنی اور مٹی کے تیل کے ٹمٹماتے ہوئے دیے دکھائی دے رہے تھے۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا جب ہم چیڑ کے جنگل میں راستہ پر ملے۔

''بینا'' اس نے جواب دیا۔ ''اور تمھارا کیا نام ہے؟''

''میرا کوئی نام نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے مسٹر نونیم۔''

''میرا مطلب ہے کہ میں نے اپنا نام خود نہیں رکھا ہے۔ ہمیں اپنے نام خود رکھنے چاہئیں۔ کیا یہ ٹھیک نہیں ہے؟''

''بینا میرا نام ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی اور نام اچھا نہیں لگتا۔''

''اچھا!''

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''کہیں نہیں۔''

''تو نیم کہیں نہیں جاتا! تم میرے ساتھ نہیں آ سکتے۔ کیونکہ میں گھر جا رہی

061
www.taemeernews.com



ہو۔ میری دادی نے گاؤں میں کتے پالے ہوئے ہیں۔ اگر تم میرے پیچھے آئے تو۔" اور وہ ہنستی ہوئی جھرنے کی طرف نیچے چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اسے نہیں پکڑ پاؤں گا۔

اونچی پہاڑی پر چلتے وقت اس کا چہرہ پسینہ سے شرابور تھا۔ وہ سفید گائے کو گھر کی طرف بلا رہی تھی۔ تیز ہوا میں پہاڑی کی ایک طرف وہ چھوٹی سی لگ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر بالوں کی لٹیں آئی ہوئی تھیں اور ان پر پھٹی ہوئی نیلی دھوتی لپٹی ہوئی تھی۔ بارش سے بچانے کے لیے میں ایک چھاتا لے کر اس کے پاس گیا۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنے جسم سے لپیٹ لیا اور اپنے چہرے کو میری طرف اٹھایا۔ میں نے بڑی تیزی اور نرم روی سے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا۔ اس کے ہونٹوں میں پانی کی بوندوں کا ایک سوندھا سا مزا تھا۔ ایسی شاندار بوندا باندی میں پانی سے شرابور وہ مجھے وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

دوسرے دن میں نے آواز سنی جیسے مجھے کوئی بلا رہا ہو۔ نونیم، مسٹر نونیم! لیکن مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ چیری کے درخت سے کچھ دور پہلے وہ مجھے مل گئی۔ اس کے پیروں سے دبی ہوئی پیڑ کی چھالیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی خوبصورت اور مضبوط رانوں کے بیچ کس کر دھوتی بندھی ہوئی تھی۔

"چیری ابھی پکی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ کبھی پکتی نہیں ہیں۔ لیکن مجھے ہری اور کھٹی ہی پسند ہیں۔ کیا تم پیڑ پر چڑھ سکتے ہو؟"

"کاش میں اب بھی پیڑ پر چڑھ سکتا۔" میں نے کہا۔

"میری دادی ماں کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہے اور وہ پیڑ پر چڑھ سکتی ہیں۔"

"مجھ میں دم خم نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی خطرہ مول لے سکتی ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

کوشش کی تو میں آسانی سے بینا کے پیچھے پیڑ پر چڑھ گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ شاخیں میرا وزن اٹھا پائیں گی۔ اور میں پیڑ کے ایک تنے پر رک گیا۔

062
www.taemeernews.com



میرا چہرہ بینا کی چھاتی کے قریب تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی کمر پر رکھا اور اس کی بانہوں کے اندر کے حصہ کو چوم لیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا اور اپنے ہاتھ کی مدد سے کچھ اور اوپر چڑھنے میں میری مدد کی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا جس سے وہ میرے اور قریب آ گئی۔

چاند اپنے عروج پر تھا اور اس کی روشنی بلوط کے لمبے پیڑوں سے ہو کر کھڑکی کے پاس پڑ رہی تھی۔ اس رات جھینگر اور چمگادڑوں کی آوازیں تمھارے گاؤں کی وادی سے آ رہی تھیں۔ لوگ ناچ گا رہے تھے اور ڈھول پیٹ رہے تھے۔ شاید کوئی تہوار تھا اور دعوت بھی تھی۔ کیا کل رات تم بھی گا رہی تھیں؟ تم جس طرح اپنے دوستوں کے ساتھ ناچتی گاتی اور ہنستی ہو کیا تم اس طرح میرے بارے میں سوچتی ہو۔ میں اس رات بالکل تنہا تھا اور تمھارے علاوہ کسی کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔

بینا۔۔۔ میں نے کئی بار تمھارا نام پکارا۔ میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ میں تمھارے ساتھ پہاڑیوں پر چاند کی روشنی میں گھومنا چاہتا ہوں۔

آج کی رات باہر بہت سی روحیں بھٹک رہی ہیں جو خاموشی سے پیڑوں میں داخل ہو جاتی ہیں اور کھڑکی کے ارد گرد گرد و غبار اڑاتی ہوئی جہاں میں بیٹھتا ہوں وہاں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ پیڑوں پر اور پرانے گھروں میں یہ عام طور پر رہتی ہیں۔ اس جگہ ایک بوڑھی عورت کا انتقال ہوا تھا۔ وہ اس گھر میں پچھلے تیس برس سے رہتی تھی۔ اس کا وجود کہیں نہ کہیں یہاں موجود ہے۔ میری نگاہ جب اس کے لمبے سے شیشے پر گئی مجھے اس کے چہرے کی بھی جھلک محسوس ہوئی۔ پیلاہٹ مائل لمبا چہرہ، سنہری بال۔ شاید اس کے گھر کی مالک مجھے پسند کرتی ہے اور مجھ پر مہربان ہے۔ بینا کیا وہ تم سے جلنے تو نہیں لگی۔

گانے بجانے کی آواز تیز تر ہوتی گئی۔ اس آگ کی روشنی میں، میں تمھارے چہرے کی چمک دمک اور تمتماہٹ، آنکھوں کی چمک اور مسکراہٹ کا تصور کرتا رہا۔ تمھارے پاس وہ سب لوگ تھے اور میرے پاس صرف آئینہ ہے، جس میں ستارے،

063
www.taemeernews.com



چمگادڑ اور بھوت پریت تھے۔

صبح سویرے اٹھا تو دیکھا کہ گھاس پر شبنم کے قطرے تازہ تھے، میں گھومتا ہوا نیچے جھرنے پر پہنچا اور پھر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھ گیا، جہاں چیڑ کے پیڑ تنہا بڑی شان و شکوہ کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے اور ہوا آہستہ روی کے ساتھ ان کی شاخوں سے گزر رہی تھی۔ یہ میری پسندیدہ جگہ تھی جہاں بیٹھ کر مجھے ایک مخصوص قسم کی طاقت کا احساس ہوتا تھا اور کبھی کبھار یہاں بیٹھ کر اپنے آپ میں تازگی محسوس کرتا تھا۔ یہاں میں گھاس پر بیٹھ کر خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ نیل فام آسمان میرے ساتھ جھولا جھول رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر باز اڑان بھر رہے تھے۔ پیڑوں کے درمیان مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا تو وہاں پر وہ موجود نہیں تھی۔

میں اپنی عقل و فہم پر فخر محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جذباتی ہو کر محبت میں ڈوب جانا کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ حالانکہ بار بار میں یہی سوچتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان ایک جسمانی دلکشی ہے اور یہ بات بھی طے شدہ تھی کہ بینا کے بارے میں میری سوچ اس طرح کی نہیں تھی جیسی دوسروں کے لیے تھی۔ کیونکہ sex اب میرے لیے تفریح یا جشن سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ میرا اس سے جی بھر چکا تھا اور اب تبدیلی کی خواہش اور خواہشات کو بھولنے کی تمنا کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

بینا کا انداز کچھ الگ تھا ـــــ جنگل میں ایک خوابیدہ پری کی طرح، وہ پرانے پیڑوں نئی اور تازہ گھاس پر اور بھوت پریت زدہ چٹانوں کے قریب گھومتی رہتی اور ان سے کچھ نہ کچھ حاصل یا محسوس کرتی ـــــ بچپن ہی سے معصوم۔ گزرتے ہوئے وقت اور حادثات سے بے نیاز ـــــ پہاڑوں اور جنگلوں سے قریب، اس طرح کی زندگی نے اس کو جادوئی اور طلسماتی بنا دیا تھا۔

تیسرا چوتھا اور پانچواں دن بھی گزر گیا اور وہ پہاڑی پر نظر نہیں آئی۔ محبت کے کرب اور مایوسی کی حالت میں، میں اس کو تلاش کرنے کے لیے یہ سوچتا ہوا نکل پڑا کہ کیا وہ کہیں چلی گئی ہے اور اس نے مجھے بھلا دیا؟ کیا ہم دونوں کو کسی نے ایک ساتھ دیکھ لیا اور اس کو گھر میں بند کر دیا؟ یا وہ بیمار ہو گئی ہے؟ یا اسے کوئی پری اڑا کر لے گئی؟

064
www.taemeernews.com



میں بڑی مشکل سے اس کے گاؤں پہنچا اور اس کے بارے میں دریافت کیا۔ ایک لڑکے نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ماں کے گاؤں چلی گئی ہے جو تقریباً سو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کا گاؤں پہاڑی کے بالکل سامنے تھا، جہاں کے مکانوں کی چھتیں سلیٹ کے ٹکڑوں سے بنی ہوئی ایک چھت کی طرح سیدھی دکھائی دے رہی تھیں۔ چہرے بہت چھوٹے اور بہت دور دکھائی دے رہے تھے جن کو پہچاننا مشکل تھا۔

اس طرح میں کڑھتا ہوا بے اطمینانی کی حالت میں اوک کے پیڑ سے ہو کر چڑیوں کے گلے سے نکلنے والی شیریں اور فاختاؤں کی میٹھی آوازیں سنتا ہوا گزرا۔ قدرتی مناظر سے میں ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ لیکن غم زدہ احساسات میرے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں حالات سے تھکا ماندہ اور پریشان تھا۔

مجھے وقت کے گزرنے کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ سالہا سال گزرتے جا رہے تھے اور میں تنہائی محسوس کر رہا تھا بالکل اس ساحل کی طرح جسے لہریں چھوڑ کر گزر جاتی ہیں اور ساحل تنہا رہ جاتا ہے۔ اسی لمحہ پرندوں کی آوازوں نے مجھے چونکا دیا جیسے وہ آوازیں کہہ رہی ہوں صرف میں اور تم ہی رہ گئے ہیں اور وقت گزر گیا۔

میں نے خود کو اس تخیلاتی دنیا سے باہر نکالا اور گاؤں سے دور پہاڑی راستوں اور جنگلوں سے قطع نظر میں نے اپنے آپ کو کام میں مصروف کر لیا اور معروضی انداز میں سوچنا شروع کر دیا اور کلسی میں لوہے کے بنے ہوئے ستونوں پر کندہ کتبوں پر ایک عالمانہ اور معنی خیز مضمون لکھا۔

لیکن رات ہوتے ہی بینا کا تصور میرے ذہن و دِل پر طاری ہو گیا۔ مجھے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بجلی جلائی تو شیشے میں بینا کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ لیکن اب یہ چہرہ بوڑھی عورت کی شکل اختیار کر چکا تھا جو بہت دیر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

www.taemeernews.com

# اور وقت گزر گیا

پریم کے لڑکے آدمی کی طرح لمبے اور صحت مند ہوتے جارہے تھے۔ ان کی موت کے بارے میں کیسے سوچا جاسکتا ہے جبکہ وہ تندرست اور توانا جوان تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے سومی اور دلجیت یاد آگئے۔ وہ تقریباً انھیں کے ہم عمر تھے۔ میں انھیں دہرہ دون میں اسکول کے زمانے سے جانتا تھا۔ سومی اور دَل کی موت ایک بار پھر میرے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ دَل کا تو نوجوانی میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ میں نے پریم کے لڑکوں پر ایک نظر ڈالی تو ان دونوں کی یادیں تازہ ہوگئیں کہ وہ اتنی جلدی اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش میں کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہ سکتا۔

سومی اور دَل۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ بارش ہورہی تھی۔ بارش کا پانی پہاڑیوں پر بہہ رہا تھا۔ ہوا میں پانی کی بو محسوس ہورہی تھی۔ میں واپس آنے کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ کو ہٹاتا ہوا پتوں کے درمیان بیلوں سے نکلتا ہوا گھومتا پھرتا گھنے جنگل میں جا پہنچا۔ وہاں مجھے پہاڑی کی تہہ میں پانی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس جگہ کا پتہ لگائے بغیر واپس جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

میں ایک چکنی چٹان سے پھسلتا ہوا ایک گھاٹی میں جا گرا جہاں مجھے ایک جھرنا

066
www.taemeernews.com



ملا جس کا پانی چھوٹے پتھروں سے بہتا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے جوتے اور موزے اتارے اور جھرنے کے پانی میں اتر گیا۔ پہاڑی کی طرف سے پانی ٹپک رہا تھا۔ پہاڑی پر جنگلی پھول اور گھاس وغیرہ تھی اور اس کی اونچائی سائے کی طرح کھائی پر پڑ رہی تھی۔ چٹانیں چکنی اور صاف ستھری تھیں۔ ان میں کچھ پیلی اور بھورے رنگ کی تھیں۔ مستقل پانی کے گرنے سے پول میں گڈھے پڑ گئے تھے اور پانی نیچے تک گر رہا تھا۔ میں وہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرا، کیونکہ پانی سال کے درخت سے ٹپ ٹپ گر رہا تھا اور میں اپنے ساتھیوں کو اس پول کے بارے میں بتانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

عام طور پر سومی نئی جگہوں کی تلاش کرتا تھا۔ پہلے تو ہم سب لوگ اس جگہ کے بارے میں سوچتے تھے لیکن بعد میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ لیکن دلجیت اور سومی نے اس جھرنے کو تلاش کرنے کا سہرا میرے ہی سر باندھا تھا کیونکہ یہ تالاب میں نے تلاش کیا تھا۔

اس تالاب کی وجہ سے ہم لوگ وہاں پہنچے تھے۔ ہم نے اس تالاب کو پردۂ خفا میں رکھا تھا اور کسی کو اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ سومی بہت اچھا تیراک تھا۔ وہ چٹان سے غوطہ لگا کر پانی کے اندر سنہری مچھلی کی طرح دور تک تیرتا ہوا چلا جاتا تھا۔ دل اس کے مقابلے میں زیادہ اچھا تیراک نہ تھا۔ میں بھی غوطہ لگاتا لیکن عام طور پر جلدی واپس آ جاتا تھا۔

چمکتی ہوئی چھوٹی مچھلیاں پانی میں بہہ رہی تھیں۔ پہلے تو ہم نے انھیں کانٹے سے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کانٹے میں لگے ہوئے چارے کو کھا کر بھاگ جاتیں۔ پھر ہم ایک بڑی سی چادر لے کر آئے اور تالاب میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈال دی۔ لیکن مچھلیاں اس کے بھی قریب نہیں آئیں۔ آخر کار سومی ایک ڈائنامائٹ لے کر آیا اور اس نے ہمیں بتائے بغیر پانی میں دھماکہ کر دیا۔ اچانک دھماکے سے ہم لوگ گھبرا گئے اور ایک لمحہ کے لیے تو کان بہرے ہو گئے۔ پہاڑی کا کچھ حصہ تالاب میں گرا اور سومی بھی نیچے گر پڑا۔ ہم نے اسے سنبھالا۔ اس دھماکے کی وجہ سے کچھ مچھلیاں آئیں لیکن اتنی چھوٹی تھیں کہ وہ کھانے لائق نہیں تھیں۔

067
www.taemeernews.com



یہ دھماکہ کرنے کے بعد سومی کے ذہن میں ایک نئی بات آئی کہ تالاب کے آخری کنارے پر ایک پشتہ بنادیا جائے، جو میری اور دل کی مدد سے تیار کر دیا گیا۔ لیکن ایک روز شام کو بہت تیز بارش ہوئی اور پانی کے تیز بہاؤ سے پشتہ وغیرہ تباہ ہو گیا اور پانی کے ساتھ ہمارے کپڑے بھی بہہ گئے، کیونکہ ہم تالاب میں ننگے ہی نہایا کرتے تھے۔ ہم لوگ رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے سوچا کہ اندھیرے میں گلی کوچوں سے نکل کر کسی طرح چھپ کر گھر پہنچ جائیں کیونکہ غلطی تو ہو ہی گئی تھی۔

ہم لوگ تالاب کے کنارے پڑی ہوئی ریت پر اچھل کود مچاتے اور کشتی لڑتے اور بھینسوں پر سواری کرتے۔ جو بھینسیں تالاب پر پانی پینے اور کیچڑ میں کھیلنے آتی تھیں، ان کی پیٹھ پر بیٹھ جاتے اور انھیں ہانک کر آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن وہ آگے نہیں کھسکتی تھیں، زیادہ سے زیادہ وہ تالاب میں بھری ہوئی کیچڑ تک لے جاتی تھیں۔

بھینسوں کو آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ زمین کا ایک طاقتور جانور ہے جو عموماً گرمی کے دنوں میں ٹھنڈی اور نرم کیچڑ میں رہنا پسند کرتا ہے۔ بھینسوں کو مٹی میں لت پت یا ان کے منہ میں بھری ہوئی گھاس دیکھ کر جس سے وہ جگالی کرتیں، بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ سوئی ہوئی نیم وا آنکھوں سے دیکھتیں اور کوؤں کا چونچیں مارنا بھی برداشت کرتی تھیں۔ وہ شاید ہر وقت یہی سوچتی تھیں یا مٹی اور کیچڑ کی نرمی سے محظوظ ہوتی تھیں اور ہمیں سورج کی تمازت سے پسینے آجاتے تھے۔ بھینس جیسے کاہل جانور سے جفاکشی اور محنت کی امید نہیں کی جا سکتی۔ گردن کو پانی میں ڈبائے رکھنا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے۔

ہم کیچڑ اور مٹی کی پروا کیے بغیر کیچڑ میں غوطہ لگاتے اور پھر ایک دم ہی گندگی سے باہر آجاتے۔ کیچڑ میں کھیلنا ہمارا شوق تھا اور ہم برف کی گیند کے بجائے مٹی کی بال بنا کر اس سے کھیلا کرتے تھے۔

سومی اور دل رات کو چھپ کر گھر سے نکل آتے اور ہم سب مل کر چاندنی رات کی خاموشی میں نہاتے کیونکہ رات کے سناٹے میں یہ سب کچھ آسان تھا۔

068
www.taemeernews.com



معلوم نہیں یہ سب کچھ کیسے ہوا مجھے ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ہم لوگ ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے اور وہ تالاب ہم دوبارہ دیکھ بھی نہیں پائیں گے۔ تقریباً ایک سال بعد سومی نے میٹرک پاس کر کے ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لے لیا۔ پچیس سال پہلے میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا جب وہ کمیشن کی تیاری کر رہا تھا۔ ان دنوں اس کی مونچھیں تھیں اور وہ ایک ہونہار نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اس تالاب کو بڑے جذباتی انداز میں یاد کیا لیکن اس طرح نہیں جیسے میں یاد کرتا تھا۔

قصہ کوتاہ، سومی نے میٹرک پاس کر لیا۔ دل اور اس کے گھر والے شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد ہی میں دوبارہ اس سے مل سکا۔ وہ ائیر فورس کی یونیفارم پہنے ہوئے لمبا چوڑا خوبصورت نوجوان پہچان میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی گول مٹول چھوٹا بچہ ہے جو کبھی میرے ساتھ تالاب پر کھیلا کرتا تھا۔ اس سے ملنے کے تین ہفتہ بعد میں نے سنا کہ وہ ہوائی جہاز کے حادثہ میں مر گیا۔

پیارے دل۔۔۔ آج بھی میں تمھیں اپنے دل کے قریب پاتا ہوں۔۔۔ اور انھیں دنوں کو یاد کرتا ہوں جب ہم پہلی بار ملے تھے۔ میں نے یہ ڈائری 1951 میں لکھی تھی۔ اس وقت میری عمر سولہ سال تھی اور تم تیرہ یا چودہ سال کے رہے ہو گے۔

یہ 7 ستمبر کا واقعہ ہے۔ سومی نے مجھ سے پوچھا تھا کیا تمھیں ہاتھی پسند ہیں؟

ہاں۔ لیکن جب وہ پالتو ہوں۔

ٹھیک ہے دلجیت، چلے آؤ رسکن کو ہاتھی پسند ہیں۔ سومی نے کہا۔

دل کوئی ہاتھی نہیں ہے۔ وہ بم میں سے ایک ہے۔

وہ مونا ہے۔ لیکن عادتیں کچھ ہاتھی کی طرح ہیں۔ اس کا موٹاپن زیادہ برا بھی نہیں لگتا۔ اگر وہ پتلا دبلا ہوتا تو شاید اتنا اچھا نہیں لگتا۔

اس کی چمکتی ہوئی شرارتی آنکھیں بڑی خوشنما لگتی ہیں۔ اور وہ تالاب۔

اس تالاب کو میں نے تیس سال کی مدت گزرنے کے بعد تلاش کیا لیکن وہ پہلے کی طرح نہیں ملا۔ وہاں کائی تھی اور کچھ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ پانی تو ختم ہو چکا تھا۔ پانی نے اپنا راستہ بدل لیا تھا، جیسے ہم بدل گئے تھے۔

069
www.taemeernews.com



یہ دیکھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی اور دل میں ایک درد سا ہوا۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ تالاب ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے پانی بہنے کی اور بچّوں کے شور و غل کی آواز سنائی دی اور میں جنگل میں اسی طرف چل دیا۔ وہاں میں نے ایک دوسرا نیا تالاب دیکھا اور تقریباً آدھا درجن بچّے پانی میں کھیل کود رہے تھے۔

بچّوں نے مجھے نہیں دیکھا اور میں پیڑ کے پیچھے چھپ کر انھیں دیکھنے لگا۔ دراصل میری آنکھیں دلجیت، سوی اور بھینسوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک میں وہاں کھڑا رہا۔ بچّوں کی اندھا دھند بھاگ دوڑ سے میرے ذہن میں ماضی کا وہی تصور ابھر آیا جب ہم اس تالاب پر کھیلا کرتے تھے، جس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں تھا۔ حقیقت میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا اور وقت بھی اپنی جگہ ساکت ہی تھا۔

www.taemeernews.com

# ابتدائی کہانیاں

دِن کے وقت نظروں سے اوجھل گاؤں کی طرف سے آنے والی دھواں دھواں سی ہوا، جلی ہوئی لکڑیوں اور اُپلوں کی مہک، تل کی جھاڑیوں سے ٹپکتی بوندیں اور چیڑ کے درختوں کی سڑی ہوئی تیلیوں سے اڑتی ہوئی خوشبو۔ یہی ہے ہمالیہ کی اصل معطر فضا کہ ایک بار کسی انسان کے خون میں سرایت کر جائے تو وہ انسان دنیا و مافیہا کو بھول کر ان پہاڑوں میں ابدی نیند سونے کے لیے لوٹ آتا ہے۔

(رُڈیارڈ کپلنگ -Rudyard Kipling)

ستمبر کی وہ پہلی تاریخ تھی۔ برسات کے ختم ہونے پر میں چیڑ کے پیڑوں سے بھرے ہوئے اس ٹیلے پر گیا جہاں میں اکثر سکون و قوت حاصل کرتا ہوں۔

کئی مہینوں کے بعد میرا اس جگہ آنا ہوا تھا۔ میں اپنے مسائل میں گھرا میدانوں میں گھومتا رہا۔ لوگوں سے ملا اور ان کی پریشانیوں میں الجھا رہا۔ غرضیکہ برسات کا موسم پری ٹبا کے سامنے واقع چیڑ کے پیڑوں سے ڈھکی ہوئی اس پہاڑی اور میرے بیچ ایک رکاوٹ تھا اور اب میں برسات میں اگی لمبی لمبی فرنوں، جھاڑیوں اور ان پر پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں پر رپ رپ کرتا چل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنے ہوئے پُل سے ندی پار کر کے سیدھی چڑھائی چڑھتا ہوا چیڑ کے ان پیڑوں کی ڈھلان پر آگیا تھا۔

071
www.taemeernews.com



پیڑوں نے مجھے دیکھتے ہی میری طرف اپنا رخ کرلیا۔ دور دراز برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں سے ہوا کا جھونکا اس وادی میں آیا، شاہ بلوط کے پیڑ پر بیٹھی نیلی لمبی نوک دار دُم والی مینا ڈر کے مارے شور و غل کرتی اڑ گئی اور پتے ایک دم خاموش ہوگئے۔ یہ پیڑ مجھے بھولے نہیں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے اپنے سر جھکا دیے اور مجھے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ چیڑ کے تین، شاہ بلوط کا ایک اور جنگلی شاہ دانے کے پیڑ مجھے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ میں ان کے قریب گیا۔ ان کے تنوں کو ہاتھ سے چھوکر ان کا استقبال کیا۔ شاہ دانے کا تنا ہموار تھا، جبکہ چیڑ کے تنے نقش و نگار سے آراستہ تھے اور شاہ بلوط کا تنا کھڑا اور پیچدار تھا۔ شاہ بلوط کا درخت سب سے اونچا تھا۔ اس کی شاخیں ہوا سے اتنی جھک گئی تھیں کہ تنا ناہموار اور غیر متوازن لگ رہا تھا اور اس فلسفی کی طرح کھڑا تھا جو اپنی پوشاک اور چہرے سے بے نیاز اپنا راز اور دانشمندی چھپائے ہوئے ہو۔ شاید اس نے بقا کا صیغۂ راز جان لیا تھا۔

شاہ بلوط اور چیڑ کے پیڑ مجھ سے زیادہ عمر کے ہیں اور برسوں سے کھڑے ہیں جبکہ شاہ دانے کا پیڑ پورے سات سال کا ہو گیا ہے کیونکہ اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

ایک دن شاہ دانے کا بیج لے کر میں نے زمین میں گاڑ دیا اور وہاں سے چلا آیا اور اس کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔ کچھ ماہ بعد لمبی لمبی گھاس کے بیچ وہ شاہ دانے کا پیڑ اگ آیا۔ مجھے اس کے بچنے کی امید نہیں تھی۔ مگر اگلے دو سال میں وہ دو فٹ اونچا ہو گیا تھا۔ بکریاں اس کے پتے کھاتی رہتیں اور جب گھسیارے کی درانتی نے اس کے تنے کو مجروح کردیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مرجھا جائے گا لیکن وہ پھر سے تر و تازہ ہو گیا اور پہلے سے بھی زیادہ بڑا۔ تین سال کے اندر تنومند ہو کر وہ پانچ فٹ اونچا ہو گیا تھا۔

مجبوری حالات کی وجہ سے نوکری کی تلاش میں ان وادیوں کو چھوڑ کر میں دو سال کے لیے دلی چلا گیا تھا۔ شاہ دانے کے پیڑ کو میں بھلا نہیں پایا اور اکثر اسے یاد کرتا رہتا اور تذکیۂ نفس کے ذریعے حوصلہ افزائی کا پیغام اسے بھیجتا رہتا۔ چند سال بعد خزاں میں جب میں واپس آیا تو اس پیڑ پر پیازی رنگ کے پھولوں کی بہار دیکھ کر میرا دل

072
www.taemeernews.com



قلابازیاں کھانے لگا۔ (نومبر کے مہینے میں ہمالیہ پر شاہ دانے کے پھول واہ!) بعد میں جب اس کا پھل پک گیا تو طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں اور بُلبلیں اس کھٹے میٹھے پھل سے سیر ہونے کے لیے آنے لگیں۔

پچھلے موسم گرما میں، میں نے اس ٹیلے پر اسی شاہ دانے کے پیڑ کے نیچے گھاس پر سو کر رات بتائی تھی۔ گھنٹوں ندی کے پانی کے قل قل بہنے اور ابابیل کی ٹھک ٹھک کرنے کی آوازیں سنتا رہا۔ پیڑ کی شاخوں کے بیچ سے ستاروں کی رِم جھم دیکھا کرتا۔ زمین و آسمان اور اس چھوٹے سے شاہ دانے کے پیڑ کی طاقت کا اندازہ کرتا رہا۔

اور اب جب برسات ختم ہو گئی ہے تو میں اس جگہ کے سکون اور طاقت سے محظوظ ہونے کے لیے آگیا ہوں۔ یہ دنیا کتنی وسیع ہے جہاں ہر وقت کچھ نہ کچھ عظیم تر ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس ٹیلے پر یہ معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں میں اپنی کہانیاں لکھوں گا۔ یہاں سے میں ہر چیز دیکھ سکتا ہوں۔ وادی کے اس پار اپنا گھر، اپنی پُشت پر رِج کی بلندی پر بسا ہوا شہر اور بازار اور سڑک جو عظیم دریا کے دہانے تک جاتی ہے۔ نیچے وادی میں بہتی ہوئی چھوٹی ندی اور گاؤں کو جاتی پگڈنڈی، سامنے پریوں کی رانی پہاڑی اور اس سے پرے کھیتوں کے نیچے چوڑی وادی اور پہاڑوں کا ایک اور سلسلہ اور ذرا دور میدانی علاقے میں ایک باغیچے میں پریم سنگھ کو دھوپ میں گدّے بچھاتے دیکھ رہا ہوں۔

یہاں سے پریم سنگھ پہاڑی پر محض ایک دھبہ سا لگتا ہے۔ لیکن میں اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے پہچان جاتا ہوں کہ وہ پریم سنگھ ہی ہے۔ آدمی سو طرح کے بھیس بدل لے مگر آخر میں اس کا اٹھنے بیٹھنے کا انداز اس کی اصلیت ظاہر کر ہی دیتا ہے۔ میرے دادا بھیس بدلنے میں ماہر تھے اور بازاروں میں کبھی پھل فروش اور کبھی نوکریاں بیچنے والا بن جاتے تھے اور ہم انھیں ہمیشہ ان کے کمر کے نمایاں خم سے پہچان جاتے تھے۔ پریم سنگھ کی کمر میں خم نہیں ہے اس کی عادت اوپر آسمان میں تکنے کی ہے۔ (موسم چاہے صاف ہو یا بادل چھائے ہوں) اس وقت بھی وہ آسمان میں تک رہا تھا۔

آٹھ برس سے پریم سنگھ کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ میں نے اس کو پہلی مرتبہ

073 www.taemeernews.com



اس وقت دیکھا تھا جب وہ سولہ سال کا لڑکا تھا۔ اب وہ بیوی بچے والا ہے۔

اس کالج میں آئے ہوئے مجھے ایک ہی سال ہوا تھا۔ وہ باورچی خانے کے باہر چبوترے پر کھڑا تھا۔ لمبا، کالی چمڑی والا لڑکا۔ سفید دانت اور بھوری گہری آنکھوں کا مالک، سفید موٹے سوتی کپڑے کی پوشاک پہنے جو شاید اس کے پاس اکیلا ہی جوڑا تھا۔ وہ نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ دیکھنے میں وہ مجھے اچھا لگا لیکن ــــ

''میرے پاس کام کرنے کے لیے نوکر ہے'' میں نے کہا۔

''جی۔ وہ میرا چچا ہی تو ہے۔''

پہاڑی علاقوں میں ہر کوئی ایک دوسرے کا بھائی، چچا یا ماما ہوتا ہے۔

''تم اپنے چچا کو نوکری سے نکلوانا چاہتے ہو؟''

''نہیں صاحب۔ چچا کہہ رہے تھے آپ مجھے کہیں کام دلوا دیں گے۔''

''میں کوشش کروں گا۔ پوچھوں گا۔ ادھر ادھر۔ گاؤں سے ابھی آئے ہو۔''

''جی صاحب۔ کل پوڑی تک دس میل پیدل چل کر اور وہاں سے بس سے۔''

''بیٹھو تمھارا چچا ابھی چائے لا کر دے گا۔'' وہ سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے سفید جوتے اتارے اور پنجوں کو مسلا۔ اس کے پاؤں خاصے بڑے اور چوڑے تھے۔ لیکن گندے نہیں تھے۔ اس کا قد بھی دوسرے لڑکوں سے زیادہ لمبا بھی تھا۔

''سگریٹ بیڑی پیتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب۔''

''یہ سچ کہتا ہے صاحب یہ لڑکا بیڑی سگریٹ کچھ نہیں پیتا۔'' اس کے چچا نے کہا۔ ''میرے دوسرے بھتیجے بیڑی سگریٹ پیتے ہیں لیکن یہ تو نرالا ہی ہے۔ نہ بیڑی پیتا ہے نہ حقہ۔''

''اور شراب؟''

''شراب کو دیکھتے ہی مجھے قے ہونے لگتی ہے صاحب۔''

''اور بھانگ؟''

''نہیں صاحب۔''

www.taemeernews.com



"تم نے کوئی بری عادت نہیں پالی۔ بڑی غیر قدرتی بات ہے۔"

"بالکل خلافِ عادت صاحب!"

"لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا ہوگا؟"

"بلکہ لڑکیاں اس کے پیچھے بھاگتی ہیں جناب۔"

"تو یہ گاؤں چھوڑ کر نوکری کی تلاش میں کیوں آیا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا دوسری طرف دیکھنے لگا اور اپنے پاؤں رگڑنے لگا۔

"تمھارا نام؟"

"پریم سنگھ۔"

"ٹھیک ہے پریم سنگھ میں تمھارے لیے کام تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔"

چند ہفتوں تک میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اس کے لیے کام تلاش کرنا بھول ہی چکا تھا لیکن جب میں اس سے بازار جاتے ہوئے سڑک پر ملا تو اس نے بتایا کہ اسے عارضی طور پر پیمائش کے دفتر میں نوکری مل گئی ہے۔ امین پیمائش کے ٹینٹوں کی رکھوالی کرنی ہوگی۔

"اگلے ہفتے ہم راجستھان جا رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"وہاں تو بہت گرمی ہوگی۔ تم پہلے کبھی ریگستان میں گئے ہو؟"

"نہیں صاحب۔"

"وہ علاقہ پہاڑوں جیسا نہیں ہے۔ اپنے دیس سے دور بھی ہے۔"

"جانتا ہوں صاحب۔ لیکن میرے پاس اور چارہ بھی تو نہیں ہے۔ شادی کے لیے مجھے کچھ روپیہ اکٹھا کرنا ہی ہے۔"

یہاں پہاڑوں پر دُلہن کی قیمت چکانی ہوتی ہے۔ یہی کوئی دو ہزار روپیہ۔

تم جلدی ہی شادی رچانے والے ہو؟"

"میرا ایک بھائی اور بھی ہے۔ وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ ماں اکثر بیمار رہتی ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے اور گھر میں گایوں کی دیکھ بھال میں اس کا ہاتھ بٹانے کے

075
www.taemeernews.com



لیے بہو تو چاہیے۔ صاحب ہمارا چھوٹا سا گھرانا ہے مگر کام زیادہ ہوتا ہے۔"

یہاں ہر کسی کے پاس ندی یا دریا کے پاس بلند مقام پر چند چھوٹے اور پتھریلے کھیت ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی گزر کے لیے چاول، جو، مکا، آلو وغیرہ کی کھیتی کرتے ہیں۔ اگر فصل زیادہ ہو بھی جاتی ہے تاہم سڑکوں کی کمی کی وجہ سے شہر کی منڈیوں میں پہنچ نہیں پاتی۔ گاؤں میں آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اور روپے پیسے کی ضرورت، کپڑے لتے، صابن، دوادارو اور ساہوکار کے پاس رہن رکھے زیورات چھڑوانے کے لیے پڑتی ہے۔ اس لیے نوجوان لوگ گاؤں چھوڑ کر شہروں میں نوکری کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ کچھ خوش قسمت فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ کوئی گھر میں یا گیراج میں، ہوٹل میں یا سڑک کے کنارے چائے کی دکان یا اسکول میں نوکری کرنے لگتا ہے۔ مسوری میں اسکولوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے یہاں خانساموں اور بیروں کی ضرورت رہتی ہے۔ مگر پریم جب آیا تو کہیں جگہ خالی نہیں تھی۔ فوج میں بھرتی ہونے کی غرض سے وہ رڑکی میں بھرتی دفتر میں گیا۔ داہنے پاؤں میں نقص ہونے کی وجہ سے اسے فوج میں نہیں لیا گیا۔ برسات کی ایک اندھیری رات کو پہاڑ کے ایک ٹکڑے کے گرنے سے اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ خود کو خوش قسمت کہتا تھا کہ پاؤں پر ہی چوٹ لگی اور اس کا سر بچ گیا۔

نوکری کے بارے میں اپنے چچا کو بتانے اور اسے الوداع کہنے آیا تھا۔ آدمی اچھا ہے شاید پھر اس سے ملاقات نہ ہو، میں نے سوچا۔ ایسے لگا جیسے رات کے وقت ایک اور جہاز اڑا جا رہا ہو اور اس کی ٹمٹماتی روشنی اندھیرے میں غائب ہو گئی ہو۔ 'آنا پھر' میں نے اس کی مسکراہٹ میں اپنی مسکراہٹ کو تحلیل کرتے ہوئے کہا اور اپنے پڑھنے کے کمرے میں ٹائپ کی مشین پر کام کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ ٹائپ کی مشین تنہائی میں ایک ادیب کے لیے مخزن ثابت ہوتی ہے۔ وہ ہر روز اس کے پیچھے بے دردی سے اس کی ہمت توڑنے کے لیے دیکھتی ہے۔ ممکن ہے مجھے پھر وہی پرو والے قلم اور سنگ مرمر کی دوات کا سہارا لینا پڑے۔ تبھی میں رات بھر قلم گھستا ہوا بالذاک اور ڈکنس کی طرح اچھا ادیب بن سکوں گا۔۔۔ دن اور رات بے شک ظاہر اچھوٹے ہوتے

076
www.taemeernews.com



ہیں، ورنہ ہم ہر کام اتنی جلدی میں کیوں کر لیتے ہیں اور پرانے زمانے کے مقابلے میں زیادہ نہیں کر پاتے۔

پریم چلا گیا اور میدانوں سے بھرے بھونڈے شہروں میں گم ہو گیا۔ اسے گئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا یا شاید میں ہی گم ہو گیا تھا کہ وہ پہلے سے کمزور اور سیاہ چہرہ لیے ہوئے مسکراتا ہوا پھر وہی نوکری کی تلاش میں نمودار ہوا۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ پہاڑی لوگ ہمیشہ کے لیے غائب نہیں ہو جاتے۔ یہاں کی روحانی چٹانیں اپنے لوگوں کو زیادہ دیر تک گم نہیں ہونے دیتیں مبادا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کو کھو بیٹھیں۔

کوشش کر کے میں نے پریم سنگھ کو ایک اسکول میں لگوا دیا۔ ہیڈ ماسٹر کی بیوی کو ایک خانساماں کی ضرورت تھی۔ پریم اچھا کھانا بنا سکتا تھا مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اسے بھیج دیا اور انھوں نے اس کو آزمائش کے طور پر رکھ لیا۔ تین دن بعد ہیڈ ماسٹر کی بیوی سڑک پر مجھے مل گئی تو وہ بہت خوشی سے ملی۔ دراصل وہ ایسی ہی عورت تھی۔

''ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں جو آپ نے اتنا اچھا لڑکا ہمارے پاس بھیجا ہے۔ وہ بہت اچھا کھانا بناتا ہے جو میرے خاوند کے لیے تو ذرا گرم ہوتا ہے مگر ہوتا ہے بڑا ذائقہ دار اور بڑا لذیذ! بڑے کام کا آدمی ہے یہ لڑکا۔'' اس نے مجھ پر ایک تیز سی نگاہ ڈالی ایسی نگاہ جس سے وہ ہر خوبصورت لڑکے کو اپنا فریفتہ بنا لیتی تھی۔ وہ لڑکا جو اس کی سفارش پر خلیفہ یا مانیٹر بنا دیا جاتا تھا۔

اس بات کا مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ اسے فقط خانساماں کی ہی ضرورت نہیں تھی بلکہ کچھ اور بھی چاہیے تھا۔ میں تو صرف یہی چاہتا تھا کہ پریم سنگھ اس کی ہر طرح سے تسلی کر دے۔

چھٹی کے روز جب وہ میرے پاس آتا تو میں اسے خوش پاتا۔

''کیسے چل رہا ہے؟'' میں پوچھتا۔

''بہت اچھے۔'' اپنی مالکن کے سے انداز میں وہ کہتا۔

''اچھے سے تمھارا کیا مطلب ہے۔ تمھیں اپنا کام تو پسند ہے نا؟''

077
www.taemeernews.com



''میم صاحب کو تو میرا کام پسند ہے صاحب۔ رسوئی گھر میں آتی ہیں تو میرے گالوں پر چٹکی بھر لیتی ہیں۔ صاحب تو کچھ نہیں بولتے۔ ان کو تو کھانے کے بعد فقط دوا ہی چاہیے۔''

''دوا وہ پہلے سے لے رہے تھے یا تب سے جب سے تم کھانا بنانے لگے ہو؟''

''یقین سے تو کہہ نہیں سکتا صاحب۔ شاید وہ پہلے سے ہی لے رہے تھے۔''

پریم سنگھ ہیڈ ماسٹر کے برآمدے میں ہی سوتا تھا اور اسے ساٹھ روپے ماہوار ملتے تھے جبکہ دہلی میں ایک خانساماں کو ایک سو ساٹھ روپے ملتے ہیں اور نیویارک اور پیرس میں تو اس سے دس گنا زیادہ۔ یہ بات میں نے پریم سنگھ سے نہیں کہی ورنہ وہ مجھے نیویارک میں نوکری دلانے کے لیے کہتا اور اس کے بعد میں اس سے کبھی نہ مل پاتا جبکہ میں ادیب ہوتے ہوئے بھی اکیلے صدر کیمپ تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس راز کو میرے چچا کین ہی سمجھتے تھے کہ کام کیے بنا روپیہ کیسے کمایا جا سکتا ہے۔ ان کی چار بہنیں تھیں۔ سبھی امیر گھرانوں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ چچا کین نے اپنا وقت بانٹ رکھا تھا۔ تین مہینے وہ نینی تال میں روبی آنٹی کے پاس، دوسرے تین مہینے کشمیر میں سُوسی آنٹی کے پاس، اگلے تین مہینے میری امّی کے پاس جام نگر میں (وہ اتنی مالدار نہیں تھیں) اور آخری تین مہینے بریلی میں جانوروں کے ہسپتال میں بڑی آنٹی میبل کے پاس جو ہسپتال چلا رہی تھیں، وہ رہتے تھے مگر ایسی جگہ وہ زیادہ نہیں ٹکتے تھے، جہاں ان کا خوشی سے استقبال نہیں ہوتا تھا۔ کوئی بھی بہن اپنے بھائی کی تین مہینے سے زیادہ خاطر تواضع نہیں کر سکتی تھی اور چچا کین بڑے سلیقے سے یہ پروگرام نبھا رہے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ میری کوئی بہن نہیں تھی اور میں ایک ناول سے ملنے والے معاوضے پر گزارہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے مجھے کچھ اور بھی لکھنا پڑتا تھا جس کے لیے میں یہاں پہاڑوں پر آ جاتا ہوں۔

''پریم، تم میرے ہاں کیوں کام نہیں کرتے؟'' میں نے کہا۔

''میرے چچا کہاں جائیں گے صاحب؟''

''وہ تو مجھے کبھی بھی چھوڑ کر جانے والا ہے۔ اس کا دادا بیمار ہے اس لیے گھر جانا

078
www.taemeernews.com



چاہتا ہے۔"

"اس کا دادا تو پچھلے برس مر گیا تھا۔"

"میرا مطلب ہے وہ جانے کے لیے بڑا بے چین رہتا ہے۔ اگر جانا چاہتا ہے تو چلا جائے مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ آج کل ویسے بھی وہ بہت سونے لگا ہے۔ صبح کی چائے مجھے ہی اس کے لیے بنانی پڑتی ہے۔"

شاہ دانے کے پیڑ کی پتیاں زرد پڑنے لگی ہیں۔ میں اس کے سائے تلے گھٹنوں پر ٹھڈی جمائے بیٹھا وادی کے اس پار پریم کو باغیچے میں مصروف پاتا ہوں۔ پچھلے سات سالوں میں جو اس نے میرے ساتھ گزارے ہیں، اس کی بہت سی ناخوشگوار باتوں کو یاد کرتا ہوں۔ یہ باتیں سلسلہ وار تو میرے ذہن میں نہیں آتیں، بس یونہی یادداشت کی اسکرین پر رنگین سلائڈ کی طرح ابھرتی ہیں۔

پریم کو میں اپنے ننھے سے بیٹے کو سلاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ وہ بچے کے گھنگھریالے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا گنگناتا ہے۔☆ گرفتار کرکے جب مجھے پولیس اسٹیشن لے جایا جا رہا تھا تو وہ میرے ساتھ تھا اور باہر اس وقت تک رُکا رہا جب تک میں پھر ظاہر نہیں ہو گیا۔ اس کی وہ مسکراہٹ مجھے آج بھی یاد ہے جب وہ دلی میں مجھ سے ملا تھا۔ لارل اور ہارڈی کی ایک پرانی فلم دیکھ کر وہ کیسے اپنی نہ رُکنے والی زوردار ہنسی ہنس رہا تھا۔

بلاشک ایسے بھی موقعے تھے جب وہ غصہ میں آتا تھا۔ ضدی اور خود سر ہو کر مجھے چھوڑ جانے کی دھمکیاں دیتا۔ اس نے مجھے زندگی میں بے حد پیار اور خوشیاں دی ہیں۔ ایک تن تنہا شخص کو اور بھلا کیا چاہیے؟

اس کی ضدی عادت نے ہی اسے ہیڈ ماسٹر کے ہاں زیادہ دن تک ٹکنے نہیں دیا۔ مسٹر گُد تو خاصے روادار تھے لیکن بیگم گُدان عورتوں میں سے تھی جو جب کسی پر

---

☆ بمبئی سے ایک وارنٹ۔ مجھ پر فحش کہانی لکھنے کا الزام تھا۔

079
www.taemeernews.com



خوش ہوتی تو بلا جھجک مدد کرتی، لاڈ پیار کرتی اور مسکا لگاتی اور جب ناراض ہوتی تو انتقام پر اتر آتی اور ہر طرح نقصان پہنچانے کے لیے تیار رہتی۔ بیگم گڈ حکومت کرنا چاہتی تھی، اپنے خاوند پر، اپنے کتے پر، اپنے چہیتے شاگرد پر اور نوکر پر۔۔۔ اپنے خاوند اور کتے پر تو اس کا کامل رعب تھا۔ شاگردوں پر جزوی طور اور پریم کو تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، کیونکہ وہ اس کی موشگافیوں کو دل پر نہیں لگاتا تھا۔ وہ اس کے مادرانہ سلوک، رسوئی گھر میں اس کے گالوں پر چٹکی بھرنے، اس کے ساتھ رگڑ رگڑ کر چلنے یا اس کی آنکھوں اور جسم کی تعریف کرنے سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ میم صاحب لوگوں کے قابل نہیں ہے اس لیے پتھر کی مورت بنا تندہی سے اپنا کام کرتا رہتا۔ اس وقت میم صاحب خود کو حقیر اور توہین زدہ سمجھتی۔ اس کی چاہت نفرت میں بدل جاتی۔ اس کی تعریف کرنے کے بجائے وہ اس کی آنکھوں، اس کے کپڑوں اور اس کی وضع قطع کا تحقیر آمیز انداز میں ذکر کرتی۔ اس کے کھانے میں نقص نکالتی۔ اب تو کھانا بالکل بے کار ہوتا ہے۔ وہ اس پر کتے کی میٹ کو چرانے اور پہاڑ پر ایک غریب گھر میں دے آنے کا الزام لگاتی۔ اس سے زیادہ نفرت انگیز جرم کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسٹر گڈ نے اسے نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دی۔ پریم اور بھی ضدی ہو گیا۔ اگلے دن اس نے کتے کو میٹ نہیں دیا اور گٹر میں پھینک دیا جسے کئی آوارہ کتے کھا گئے اور خود سنیما دیکھنے چلا گیا۔

یہ اس کی نوکری کے کھو جانے کا بہانہ تھا۔ ''مجھے اب گھر جانا ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا ''میم صاحب کی مہربانی سے مجھے اس علاقے میں اور کہیں نوکری نہیں مل سکتی۔''

''کچھ دن رکو تو سہی'' میں نے کہا۔

''میرے پاس اتنی رقم ہے صاحب کہ گھر جا سکوں۔''

''اسے گھر جانے کے لیے سنبھال کر رکھو۔ کچھ دن کے لیے تم میرے پاس ٹھہر کر نوکری تلاش کرتے رہو۔ کھانا تم اپنے چچا کے ساتھ کھا لینا۔ وہ برا نہیں مانے گا۔''

080
www.taemeernews.com



لیکن اس کے چچا کو یہ بات ناگوار لگی۔ اسے یہ پسند نہیں تھا کہ اپنے بھتیجے کی نوکری بچائے۔ اسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں پریم سنگھ ہی اس کی جگہ نہ رکھ لیا جائے۔

پریم سنگھ ہفتے بھر سے زیادہ میرے پاس نہیں ٹھہرا۔

ٹیلے پر اکتوبر کے مہینے میں گھاس زرد پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل سردی کی آمد کی خبر دے رہے تھے۔ درختوں پر سکوت کا عالم تھا۔ پنچھی بھی چپ سادھے ہوئے تھے۔ شاہ بلوط کے درخت پر فقط جھینگر ہی اپنے راگ میں مست تھا اور شام کو کسی طوفان کے اٹھنے کی آگاہی دے رہا تھا۔ ایسے ہی طوفان میں پریم اپنی بیوی بچے کے ساتھ میرے پاس آیا تھا۔ بات تو یہ بہت آگے کی ہے۔

اس کے گاؤں چلے جانے کے کئی مہینے بعد میں پھر اس سے ملا۔ اس کے چچا نے بتایا کہ دلّی میں کسی جگہ اس کی نوکری لگ گئی ہے۔ مجھے اس کا پتہ بھی دیا جو نامکمل تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اگلی بار جب میں دلّی جاؤں گا تو پریم کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔

مئی کا مہینہ تھا، جب میدانوں میں گرم لُو چلنے لگتی ہے۔ آسودہ حال لوگ تو پہاڑوں کا رُخ کرتے ہیں۔ نئی دہلی شہر مجھے کسی بھی موسم میں اچھا نہیں لگا اور موسم گرما سے تو مجھے شدید نفرت تھی۔ لوگ بڑے چڑچڑے اور گھٹیا مزاج کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھے تو دلّی جانا ہی تھا۔ نہ جانے کس وجہ سے۔ شاید اس وقت میرا جانا ضروری تھا اور یہی موقعہ تھا کہ میں پریم کو ڈھونڈ سکتا تھا۔

بات کچھ بن نہیں رہی تھی۔ جو پتہ میرے پاس تھا غلط تھا۔ میں دو گھنٹے تک دور دراز و سنت وہار میں گھومتا رہا، جہاں پیڑ پودوں کا نام نشان بھی نہیں تھا۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ جو بھی گھریلو نوکر مجھے ملتا میں اس سے پوڑی گڑھوال کے گاؤں کولی کے پریم سنگھ کے متعلق پوچھتا۔ پریم سنگھ نام کے کئی نوکر تھے۔ لیکن کولی گاؤں کا رہنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں لوٹ آیا اور دو دن تک مسوری

081
www.taemeernews.com



لوٹنے سے پہلے لو کے اثر کو زائل کرتا ہے۔ شکر ہے خدا کا جس نے یہ پہاڑ پیدا کیے۔

پریم کے چچا نے مجھے نوکری چھوڑنے کا نوٹس دے دیا۔ دہرہ دون میں اسے اچھی نوکری مل رہی تھی اور وہ بھی جانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ میں نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

اگلے چھ ماہ میں نے بنا کسی نوکر کے گزار دیے۔ مجھے کسی طرح کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اکیلے رہنے کی عادت جو تھی۔ دراصل مجھے نوکر کی نہیں بلکہ ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ میری کاٹج ہر طرح سے پُر سکون تھی۔ مردہ لوگوں کی روحیں ہمدردی سے پیش آتی تھیں اور کسی طرح سے مخل نہیں ہوتی تھیں۔ سیٹی بجانے والے پرندے کا گیت میٹھا تھا لیکن وہ میرے لیے نہیں تھا۔ وادی سے پرے کہیں سے بانسری کی آواز آرہی تھی اور بجانے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری انسیت لال لومڑی سے ہو گئی تھی جو کاٹج کے پاس گھومتی رہتی تھی۔ ایک رات اس کو جو دیکھا تو یہ چند لائنیں لکھ دیں۔

پچھلی رات گھر لوٹتے ہوئے
دیکھا ایک لومڑی کو ناچتے
چاند کی ٹھنڈی چاندنی میں
میں رُکا، دیکھا اور چھوٹی سڑک پر ہو لیا
میں جانتا تھا
اس رات پر اُس کا حق ہے
کبھی کبھی الفاظ سچ بولتے ہیں
میں اس تنہا لومڑی کی مانند
صبح کی شبنم پر ناچتا ہوں

برسات کے موسم میں جب پیڑوں پر سے بوندیں ٹپکتی ہیں اور وادی سے دھند اٹھتی ہے، میں خوب شاعری کرتا ہوں۔ تنہائی شاعروں کا سرمایہ ہے۔ لیکن شاعری نے مجھے روپیہ پیسہ نہیں دیا جس کی میرے پاس کمی تھی اور جیسے ہی میں سوچ

082
www.taemeernews.com



میں پڑا تھا کہ اپنی اس آزادی کو تیاگ کر پھر سے نوکری کرلوں کہ ایک ناشر بچوں پر لکھی کہانیوں کی پیپر بیک کتاب چھاپنے کے لیے میرے پاس آیا اور میں پھر اسی آزادانہ ڈھنگ سے تین ماہ تک لکھتا رہا۔

نومبر کا مہینہ تھا۔ کتاب کا جشن منانے کے لیے میں لنڈور بازار سے ہوتا ہوا ٹہری کی سڑک پر آگیا۔ سیر کرنے کے لیے ماحول بہت اچھا تھا۔ جب میں شہر کی بیرونی حدود کے پاس پہنچا تو اچھا خاصا اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے کسی کو کاٹج کے پاس انتظار کرتے دیکھا۔ میں اس کے پاس سے گزر گیا۔

میں خود کا نہ ہوا
تو کون میرا ہوگا
اگر میں اوروں کے لیے نہیں
کون ہوں میں؟
اب نہیں تو کب؟

قدیم ہیبیر و سینٹ جلیل کے یہ بول سن کر میں چونک اٹھا۔ لوٹ کر اس جگہ آیا جہاں وہ نوجوان کھڑا تھا۔ دیکھا تو وہ پریم سنگھ تھا۔

"پریم تم یہاں ٹھنڈ میں باہر کیوں بیٹھے ہو اندر کیوں نہیں چلے گئے؟" میں نے کہا۔

"گیا تو تھا صاحب پر وہاں تالا پڑا تھا۔ سوچا آپ کہیں گئے ہوں گے۔"

"یعنی تم سڑک پر ہی بیٹھے رہے؟"

"صرف آج رات کے لیے صبح کو دہرہ چلا جاؤں گا۔"

"آؤ۔ گھر میں چلیں۔ میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے تمھیں دہلی میں بہت ڈھونڈا لیکن تمھارا پتہ نہیں ملا۔"

"میں نے وہاں کی نوکری چھوڑ دی ہے۔"

"تمھارا چچا بھی چلا گیا ہے۔ تم میرے پاس کام کروگے؟"

"جب تک آپ چاہیں صاحب۔"

083
www.taemeernews.com



ہم گھر کے اندر نہیں گئے اور بازار میں آکر سندھی مٹھائی والے کی دُکان پہ کھانا کھایا۔ گرم گرم پوریاں اور گرم میٹھی چائے۔

ہم دونوں چاندنی رات کی روشنی میں پیدل گھر آئے۔ ننھی سی لومڑی کو اکیلے ہی ناچتے دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔

یہ بات بیس سال پرانی ہے۔ پریم، اس کی بیوی اور تین بچے آج بھی میرے پاس ہیں۔ اب ہم دوسری پہاڑی پر ایک اور مکان میں رہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

# مرگِ شجر

موسم سرما میں ایک دن میپل وڈ پہاڑی کی پُر سکون فضا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ حکومت نے پہاڑوں کے درمیان ایک نیا روڈ بنانے کا فیصلہ کیا۔ محکمہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی نے میرے گھر کی بڑی کھڑکی سے چھ فٹ کے فاصلے پر سڑک بنانے کے لیے جگہ مناسب سمجھی جس کی وجہ سے پیڑوں کو کاٹنا پڑا۔

میں اپنے جرنل میں پیڑوں کو کاٹے جانے کا ذکر کر چکا تھا۔ کاٹے جانے والے پیڑوں میں پہلا پیڑ اخروٹ کا تھا جس کی نشو نما میں گزشتہ دس برسوں سے اسی طرح دیکھ رہا تھا جیسے پریم کے چھوٹے بیٹے راکیش کی۔۔۔ میں نے اس پیڑ کی نئی پتیوں، کونپلوں، گرمیوں میں ہرے پتوں اور ستمبر میں ان کی نوکوں کو سنہری رنگ میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر اخروٹ پک کر زمین پر گرتے۔ یہ درخت ٹھیک میری کھڑکی کے پاس تھا جہاں روڈ پر ایک اونچا پشتہ لگا ہوا تھا۔

اس بڑے جنگل میں ایک بڑھتے ہوئے چھوٹے دیودار کے درخت کو بھی کاٹ دیا گیا۔ کچھ سال پہلے سورج کی روشنی نہ ملنے کی وجہ سے اس کی نشو و نما رک گئی تھی۔ شاہ بلوط کی گھنی شاخوں میں یہ چھپ گیا تھا اس لیے میں نے اس کی پھیلی ہوئی شاخوں کو کاٹ دیا تھا جس سے دیودار کی نشو و نما اور تیز ہو گئی۔ اس کو بڑا ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا گیا۔ جیسے پچھلے ماہ میرا چھوٹا بھائی دلّی میں سڑک حادثہ کا شکار ہوا۔ دونوں ہی

085
www.taemeernews.com



سڑک حادثہ کا شکار ہوئے۔ دیودار کی موت پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ذریعہ ہوئی اور میرا بھائی ٹرک حادثہ سے فوت ہوا۔

میرے گھر کے قریب چھوٹی سی جگہ میں ہی شاہ بلوط کے بیس درخت گرادیے گئے اور یہ سڑک دیکھتے ہی دیکھتے جبار کے کھیت تک پہنچ گئی جو یہاں سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ایک ہزار سے زیادہ شاہ بلوط کے پیڑوں کے علاوہ بہت سے اچھے درخت جیسے چیڑ، میپل اور دیودار بھی ختم کردیے گئے۔ زیادہ تر درخت تو بلاوجہ کاٹ دیے، حالانکہ وہ روڈ سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھے۔

ان پیڑوں سے ٹھیکیدار کے علاوہ کسی کو کوئی پریشانی نہیں تھی جو ان کٹے ہوئے درختوں کو خریدتا تھا۔ لیکن جانیے درخت اور جھاڑیاں کتنی ضروری ہیں۔

دودھ والے نے کہا کہ وہ راستے میں بہت خوشنما لگتے تھے۔

ایک کارآمد درخت جس کی صاف ستھری پتیاں چارے کے کام آتی تھیں وہ بھی کاٹ دیا گیا! اس نوجوان نے مجھے بتایا کہ کبھی پاوری آکر دیکھو راستے میں اب کوئی درخت نہیں ہے۔ منظر بہت خوفناک لگتا ہے۔

ٹھیک ہے اب میں یہیں رہ کر اس تباہ کن پہاڑی کا نظارہ کروں گا لیکن دودھ والا اب چارے کے لیے کوئی دوسری جگہ تلاش کرے گا کیونکہ شاہ بلوط کے پیڑ ختم ہو چکے ہیں۔

راکیش میپل کو تتلیوں والا درخت کہتا تھا کیونکہ اس درخت کے جب پنکھ والے بیج اڑتے تو وہ ہوا میں ادھر ادھر اڑتے ہوئے تتلیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اب نہ کوئی میپل باقی رہ گیا ہے، نہ چمکدار سرخ پتے آسمان کی جانب اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور نہ کوئی پرندہ۔

یوں سمجھ لیجیے کہ پیڑوں کے کٹنے کی وجہ سے گھر کے آس پاس کوئی پرندہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خوبصورت پرندے اور کبوتر شاہ بلوط کی ہری پتیوں میں پھڑپھڑاتے تھے۔ لمبی دم والے چتلے کوّے درختوں میں ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے۔ دیودار کے پیڑ کی چوٹی سے جہاں چڑیاں بسیرا کرتی تھیں چیخنے کی آوازیں

086
www.taemeernews.com



آ رہی تھیں۔ سبھی پرندے جنگل چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کی تلاش میں تھے۔

صرف کوّے دکھائی دے رہے تھے جنھوں نے انسان کے پاس آنا جانا سیکھ لیا تھا اور جن کی تعداد گھروں اور سڑک کے پاس دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی چاروں طرف کوّے ہی باقی رہ جائیں گے۔ اب صرف گزرتے ہوئے ٹرکوں کی گڑگڑاہٹ، ایک کونے میں چائے پکوڑے کی دُکان، موٹر گاڑیوں کے ہارن اور بریک کی آوازیں، اب آوازیں ہی آوازیں تھیں۔

مسلسل دھماکوں سے پہاڑوں کا سکون ختم ہو گیا تھا۔ ہزاروں سال پرانی چٹانوں کو ڈائنامائیٹ سے اڑانے کی آواز سے بہادر پرندے اور جانور بھی ڈر کر بھاگ گئے، یہاں تک کہ نڈر لنگوروں کی بھی ہفتوں تک شکلیں دکھائی نہیں دیں۔

بہر حال ہمیں وہاں چائے کی کسی نئے دُکان کے کھلنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اگلی پہاڑی پر جہاں ابھی سڑک نہیں نکلی تھی ایسی کئی جگہیں موجود تھیں جہاں نئی چائے کی دکان کھولی جا سکتی تھی۔ حالانکہ میرا یہ سوچنا غلط بھی تھا اور ناکامی کی نشانی بھی، بالکل اسی طرح جیسے پیڑوں کا گرانا یا انھیں کاٹنا ان کی شان کے خلاف ہوتا ہے۔

بس ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں لیکن پہاڑ اپنی جگہ جامد و ساکت ہمیشہ قائم و دائم رہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

# جنون

## تمہید

شدت کی گرمی پڑ رہی تھی جب 10 مئی کو میرٹھ میں بغاوت ہو گئی۔ سپاہیوں نے اپنے ہی انگریز افسروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ شہر میں بھی لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ جیل کے دروازے توڑ دیے گئے اور ہتھیار بند قیدی شہر اور چھاؤنی میں بسے ہوئے انگریزوں پر پل پڑے۔ اُن کے گھروں کو آگ لگا دی اور لوگوں کو قتل کر دیا۔ کئی باغی دستے دلّی کی طرف روانہ ہو گئے کہ وہی ان کے جمع ہونے کی جگہ تھی، جہاں امن پسند شاعر بادشاہ بہادر شاہ کو اچانک پھر نام نہاد شہنشاہیت کا تاج پہننا پڑا۔ انگریز فوج نے جو اس وقت شملہ کے پہاڑوں پر ہوا خوری کے لیے گئی ہوئی تھی، دلّی کے لیے کوچ کیا۔ اسی اثنا میں بغاوت دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی۔ دلّی سے دو سو پچاس میل دور 30 مئی کو شاہ جہاں پور میں بڑی پریشانی کا عالم تھا۔

چھاؤنی میں ریڈ مین ایک اینگلو انڈین گھرانہ تھا۔ اس کے مکان کو رات کے وقت آگ لگا دی گئی۔ ریڈ مین اپنے بال بچّوں سمیت بچ گیا مگر اس کا سارا سامان لوٹ لیا گیا یا توڑ پھوڑ دیا گیا۔ اسی رات کو ایک جانی پہچانی صورت وہاں دکھائی دی۔ جاوید خان ایک روہیلا پٹھان جس کو شہر کا ہر آدمی جانتا تھا، اسے آگ زنی کے جرم کے شبہ میں قید

088
www.taemeernews.com



کر کے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔

شاہ جہاں پور کے بازاروں میں جاوید خان کا خوب دبدبہ تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کوئی بھی خطرناک اور جوکھم بھرا کام کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ اس کو اس کا مناسب معاوضہ مل جائے۔ حکومت نے اسے کئی وارداتوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے حراست میں لے لیا تھا۔ لیکن جاوید انگریزی قانون سے واقف تھا۔ اس نے مجسٹریٹ سے گواہ پیش کرنے کے لیے کہا۔ کوئی بھی شخص اس بات کی گواہی دینے کے لیے آگے نہیں بڑھا جس نے جاوید خان کو جلتے ہوئے بنگلے سے بھاگتے ہوئے دیکھا ہو۔ مقدمہ مزید گواہ پیش کرنے کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ جاوید جب کچہری کے کمرے سے باہر نکلا تو یہ کہنا مشکل تھا کہ سپاہی اس کی رہنمائی کر رہے تھے یا وہ سپاہیوں کی۔ کمرے سے باہر آنے سے پہلے اس نے ایک حقارت آمیز نگاہ مجسٹریٹ مسٹر رِکٹ پر ڈالی اور کہا۔ ”میں اپنے گواہ کل پیش کروں گا۔ میں نہیں جانتا تم ان کو سنو گے یا نہیں۔“

ریڈ مین کے بنگلے کو جلائے جانے کی واردات نے شاہ جہاں پور میں مختصر سی انگریزی آبادی پر کسی خطرے کا اثر نہیں ڈالا تھا۔ میرٹھ دور تھا اور مقامی اخبار 'مسلایٹ' میں ہنگامے کے تعلق سے زیادہ خبریں نہیں تھیں۔ فوجی افسران کسی غیر متوقع بات کے ہونے سے بے خبر اپنی گشت پر تھے اور لوگ اپنے کاموں پر جا رہے تھے۔ رات کو وہ حسب معمول کھانے، پینے اور ڈانس کے لیے جمع ہوئے۔

30 مئی کو مہمان نوازی کی باری ڈاکٹر باولنگ کی تھی۔ اس کے ڈرائنگ روم میں نوجوان لفٹیننٹ اسکاٹ نے گٹار پر ایک دھن چھیڑی اور مسز باولنگ نے ایک عاشقانہ گیت گایا۔ چار فوجی افسر کوٹ پیس کھیلنے میں منہمک تھے۔ جبکہ مسز رکٹ، مسز جینکنز، کلکٹر اور کپتان جیمز 'ایکشما' وہسکی کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے موسم کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

فقط لباڈور اور اس کے گھر والوں کو گڑبڑ ہونے کا امکان تھا اس لیے وہ پارٹی (دعوت) میں شامل نہیں ہوئے۔

089
www.taemeernews.com



لباڈور کی عمر 42 برس کی تھی اور اس کی بیوی 38 ویں سال میں تھی۔ ان کی لڑکی روتھ بڑی خوبصورت تھی۔ اس کے بال سیاہ اور آنکھیں چمکدار تھیں۔ ابھی پندرہ دن پہلے فتح گڑھ میں مسز شیلڈ کے اسکول سے اُسے اس کی ماں نے اس خیال سے کہ گھر پر وہ محفوظ رہے گی بلوالیا تھا۔

لباڈور کا باپ ایک فرانسیسی جانباز تھا اور مراٹھا فوج میں رہ چکا تھا۔ اس کی ماں رامپور کے مشہور خاندان سے تھی۔ اس کا نام مریم تھا۔ وہ اور اس کے بھائی عیسائی تربیت میں پلے بڑھے تھے۔ مریم جب اٹھارہ برس کی ہوئی تو اس کی شادی لباڈور سے ہوگئی۔ لباڈور ایک چپ چاپ رہنے والا سادہ لوح آدمی تھا اور مجسٹریٹ کے دفتر میں کلرک تھا۔ وہ جرسی (چینل جزیرے) کے ایک تاجر کا پوتا تھا۔ اس لیے اس کا پورا نام جرسی لباڈور تھا۔

جبکہ چھاؤنی کی بیشتر انگریز عورتیں نوکروں سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی تھیں، مریم لباڈور ملنسار ہونے کے ناطے ان لوگوں سے بات چیت کر کے لطف اٹھاتی تھی۔ وہ لوگ اکثر دلچسپ شرمناک کہانیاں جن سے وہ بخوبی واقف تھے، سنا سنا کر اس کا دل بہلایا کرتے تھے اور مریم کو اس طرح جو کچھ اس نے سنا تھا یقین ہو چلا تھا کہ کچھ ہی دنوں میں شہر میں ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں گے۔ میرٹھ میں ہوئے حادثات کی خبریں بازار میں اور سپاہیوں میں عام تھیں اور ایک فقیر، جو دریائے کھناٹ کے پاس رہتا تھا، نے یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا جلد ہی ہندوستان سے خاتمہ ہو جائے گا۔ مریم نے اپنے خاوند اور لڑکی کو اس شام باولنگ کے یہاں دعوت میں جانے سے روک دیا تھا۔ مریم کی بیٹی بلاناغہ گرجا جایا کرتی تھی۔ یہ ایک حیران کر دینے والی التجا تھی، یہاں تک کہ اگلے روز اتوار کو چرچ نہ جانے کا بھی مشورہ دیا گیا تھا۔

روتھ کو من مانی کرنے کی عادت تھی۔ وہ گرجا جانے کے لیے بضد تھی۔ اس کا باپ بھی راضی ہو گیا تھا۔

آفتاب صاف و شفاف چمکدار آسمان میں اگ آیا تھا اور خوش قسمت تھے وہ

090
www.taemeernews.com



لوگ جو پو پھٹتے ہی اٹھ گئے تھے اور دریا کی طرف سے آرہی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سات بجے گرجا گھر کا گھنٹہ بج اٹھا۔ لوگ چھاؤنی میں بنے اس چھوٹے سے مضبوط گرجا کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ لباڈور اور اس کی بیٹی کی طرح اتوار کی پوشاک میں پیدل چل رہے تھے تو کچھ بگھیوں پر سوار تھے یا پالکیوں میں تھے جنھیں پسینے سے تر کہار کندھوں پر اٹھائے ہوئے دوڑ رہے تھے۔

سینٹ میری کا یہ چھوٹا سا گرجا گھر شاہ جہاں پور کی چھاؤنی کے جنوبی کنارے پر آموں کے ایک پرانے باغ کے نزدیک تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے تین راستے تھے۔ ایک جنوب میں مینار کے نیچے سے جبکہ توشہ خانہ کا دروازہ شمال کی جانب تھا۔ ایک تنگ زینے سے مینار پر بھی جایا جا سکتا تھا۔ مشرق کی جانب دریا کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں خربوزے کی کاشت ہوئی تھی۔ مغرب کی طرف شہر کی حد بندی کے ساتھ ساتھ کھلا میدان تھا۔ شمال میں پریڈ کا میدان تھا جو سپاہیوں کی بارکوں تک پھیلا ہوا تھا۔ پریڈ کے میدان کی ایک طرف رجمنٹ کے انگریز افسروں کے بنگلے تھے۔ یہ لوگ کسی بھی شورش سے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے۔

آگے کی کہانی روتھ کی زبانی۔

## گرجا گھر میں

پاپا اور میں جب گھر سے باہر نکلے تو ہم نے کئی سپاہیوں کو سڑک پار کر کے دریا میں نہانے کے لیے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہماری طرف اس قدر غضبناک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ میں پاپا کے ساتھ چپک گئی اور آہستہ سے کہا "دیکھو پاپا یہ لوگ کیسے دیکھ رہے ہیں!" غالباً پاپا کو ان کے چہروں پر کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی۔ سپاہی اکثر دریا کھنات کی طرف جاتے ہوئے اسی راستے سے گزرتے تھے اور میرا خیال ہے دفتر جاتے ہوئے پاپا کی ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔

ہم جنوبی پھاٹک کی طرف سے گرجا میں داخل ہوئے اور بائیں طرف کی آخری

091
www.taemeernews.com



نشست پر بیٹھ گئے۔ بہت سے لوگ پہلے ہی گرجا میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن میں نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا کہ وہ کون لوگ تھے۔ ہم اعتراف (Confession) کے دوران ابھی جھکے ہی تھے کہ باہر سے ہنگامے اور چیخ و پکار کا شور ہمارے کانوں میں پڑا جو قریب تر ہوتا گیا۔ چرچ میں حاضر سبھی لوگ کھڑے ہو گئے۔ پاپا اپنی سیٹ سے اٹھ کر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ان کے پاس آ گئی۔

چھتے پر چھ سات آدمی تھے جن کے چہرے ناک تک ڈھکے ہوئے تھے جیسے وہ اکھاڑے میں کشتی کرنے جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ لوگ ہماری طرف لپکے اور ایک نے ہم پر وار کیا جو خالی گیا اور تلوار دروازے میں دھنس گئی۔ پاپا بائیں ہاتھ سے دروازے کو پکڑے ہوئے تھے اور میں اس کے نیچے سے نکل کر گرجا کے صحن میں آ گئی۔ پاپا پر دوسرا اور تیسرا وار ہوا جس نے ان کے داہنے گال پر زخم کر دیا۔ پاپا نے ایک حملہ آور کے ہاتھ سے تلوار چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن ان کا ہاتھ سیدھا تلوار کی دھار پر پڑا۔ وہ بھی زور سے کہ ان کے داہنے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹ کر الگ ہو گئیں۔ وہ بس اتنے ہی زخمی ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ گرے نہیں تھے لیکن خون بے تحاشہ ان کے ہاتھ سے بہہ رہا تھا۔ اس وقت تک میں چھتے پر سے دیکھ رہی تھی اور حیران و پریشان تھی کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے پاپا سے پوچھا تھا کہ اتنا خون کیوں نکل رہا ہے۔

"میری جیب سے رومال نکال کر میرے چہرے پر پٹی باندھ دو۔" انھوں نے کہا۔ میں نے پاپا کے اور اپنے رومالوں کی ایک پٹی بنائی اور ان کے سر کے گرد باندھ دی۔ پاپا نے کہا وہ گھر جانا چاہتے ہیں۔ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو چھتے سے باہر لے جانے کی کوشش میں تھی کہ چند ہی قدم چلنے پر بے ہوشی کے سے عالم میں بولے:

"روتھ بیٹی میں نہیں چل سکتا۔ آؤ ہم واپس گرجا گھر میں ہی چلتے ہیں۔"

ہتھیار بند بلوائیوں نے گرجا گھر پر صرف ایک ہی حملہ کیا تھا اور توشہ خانہ کی طرف سے باہر نکل گئے تھے۔ پاپا کو زخمی کرنے کے بعد وہ گرجا کے درمیانی راستہ کے دائیں بائیں دونوں طرف تلواریں چلا رہے تھے۔ ایک حملہ لفٹیننٹ اسکاٹ پر بھی

092
www.taemeernews.com



ہوا لیکن اس کی ماں اس کے اوپر گر گئی اور تلوار اس کی پسلیوں میں گھس گئی۔ اس کی تنگ پوشاک نے اسے بری طرح زخمی ہونے سے بچالیا۔ مسٹر رِکٹ، مسٹر جیکنز، کلکٹر اور مسٹر میک کُلم توشہ خانے کے راستے سے بھاگ نکلے۔

باقی سب لوگ گھنٹہ گھر پر چڑھ گئے اور پاپا کے کہنے پر میں بھی اُن کے ساتھ ہولی۔ ہم نے کپتان جیمز کو گرجا گھر کی طرف گھوڑے پر آتے ہوئے دیکھا۔ شاید اسے خبر نہیں تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہم اسے آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے چلائے اور جیسے ہی اس نے آنکھ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا پریڈ گراؤنڈ میں اکٹھے سپاہیوں میں سے ایک نے اسے گولی کا نشانہ بنایا اور وہ گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ دو اور افسر میس کی طرف سے دوڑتے ہوئے آرہے تھے اور سپاہیوں سے کہہ رہے تھے۔ ”ارے بچو! یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ سپاہیوں کے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کسی نے ان کی ایک نہ سنی۔ سپاہیوں میں ان کا اچھا خاصا رسوخ تھا اور اسی لیے ان کو ہاتھوں میں پستول لیے بُرج پر ہمارے پاس آنے سے کسی نے نہیں روکا۔

اسی وقت ہم نے ایک بگھی کو تیزی سے گرجا گھر کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یہ بگھی ڈاکٹر باولنگ کی تھی اور اس میں وہ خود، ان کی بیوی اور بچّہ اور اس کی آیا سوار تھے۔ بگھی پریڈ گراؤنڈ سے باہر آرہی تھی اور جیسے ہی آدھے راستے میں پہنچی کہ ایک گولی ڈاکٹر باولنگ کے لگی۔ وہ بگھی کے آگے بیٹھا ہوا تھا۔ گولی لگتے ہی وہ اپنی سیٹ پر دوہرا ہو گیا لیکن لگامیں ہاتھ سے نہیں چھوڑیں۔ بگھی لگ بھگ گرجا گھر کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ایک سپاہی نے بڑھ کر مسز باولنگ پر وار کیا جو خالی گیا اور وہ بال بال بچ گئی۔ بگھی جیسے ہی گرجا گھر پہنچی کچھ افسران بھاگ کر ڈاکٹر باولنگ کو بگھی سے اتارنے کے لیے گئے۔ وہ زندگی کے لیے ان کی بانہوں میں جوجھ رہا تھا اور آخر جب اسے زمین پر اتارا گیا تو وہ دم توڑ چکا تھا۔

میں بھی ان افسران کے ساتھ برج سے نیچے آگئی اور اپنے پاپا کو دیکھنے کے لیے بھاگی۔ وہ دیوار کے سہارے سے خون میں لت پت بیٹھے تھے۔ انھوں نے کسی قسم کے درد کی کوئی شکایت نہیں کی۔ ان کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور وہ بمشکل اپنی

093
www.taemeernews.com



آنکھیں کھول سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے گھر جا کر ماں سے کہہ کر ایک چارپائی یا پالکی کے ساتھ کسی کو بھیجنے کے لیے کہا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہو گیا تھا کہ میں بدحواس ہو گئی تھی۔ مسز باولنگ اور دوسری عورتیں رو رہی تھیں۔ لیکن میری آنکھوں میں آنسو کا قطرہ تک نہیں تھا۔ پاپا کے چہرے پر دو گہرے زخم تھے۔ میں ان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن ان کی جان بچانے کے لیے اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا کہ میں بھاگ کر گھر جاؤں اور ایک پالکی کا بندوبست کر کے لے آؤں۔

میں پاپا کو گرجا گھر کی پتھر کی دیوار کے سہارے چھوڑ کر بھاگتی ہوئی توشہ خانہ کی طرف آئی اور مسٹر رِکٹ کی لاش کے اوپر گرتے گرتے ہوئی بچی، جو توشہ خانہ کے دروازے سے تقریباً بارہ فٹ کی دوری پر پڑی تھی۔ کسی ماہر اور مضبوط تلوار باز نے اس کے بائیں کندھے پر اس طرح سے حملہ کیا تھا کہ اس کا سر اور دایاں بازو دھڑ سے الگ ہو گئے تھے۔ اس نظارے کو دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گئی اور ٹبلر لوگوں کے احاطے سے بھاگتی ہوئی گھر کی طرف دوڑی ہوئی چلی گئی۔

راستے میں مجھے کوئی نہیں ملا۔ کسی نے مجھے نہ تو للکارا نہ ہی میرا راستہ روکا اور نہ ہی میرے ساتھ کسی طرح کی بدتمیزی کی گئی۔ چھاؤنی خالی اور اجاڑ سی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر جیسے ہی میں ٹبلر لوگوں کے احاطے کے آخری کنارے پر پہنچی مجھے اپنے گھر سے آگ کی لپٹیں اٹھتی دکھائی دیں۔ میں پھاٹک پر رکی۔ میں اپنی ماں کو ادھر ادھر دیکھ رہی تھی لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ دادی بھی وہاں نہیں تھی اور نہ ہی کوئی نوکر چاکر۔ پھر میں نے لالہ رام جی لال کو سڑک پر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

"گھبراؤ مت میری بچی" وہ بولا "تمھاری ماں دادی اور باقی سبھی لوگ محفوظ ہیں۔ آؤ میں تمھیں ان کے پاس لے چلتا ہوں۔"

لالا رام جی لال کی نیت پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں جب بچی تھی تو وہ مجھے گھٹنوں پر جھلایا کرتے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی میں اتنی بڑی ہوئی تھی۔ وہ ہمارے پرانے گھر سے لگ بھگ تیس گز کے فاصلے پر ایک جھونپڑی میں لے گیا۔ یہ ایک کچا مکان تھا جو سڑک کے کنارے پر تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ لالا نے

094
www.taemeernews.com



دروازے پر دستک دی۔ لیکن اندر سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے دروازے کی دراز میں سے آہستہ سے کہا "میں بابا میرے ساتھ ہے۔ دروازہ کھولیے۔"

دروازہ کھلتے ہی میں اپنی ماں کی بانہوں سے لپٹ گئی۔

"شکر ہے خدا کا" ماں چلائی "آخر ایک کی تو جان بچ گئی۔"

"پاپا گرجا گھر میں زخمی پڑے ہیں۔" میں نے کہا "کسی کو بھیجو ان کو لے آئے۔"

ماں نے لالا کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور وہ ماں کی آنکھوں کی التجا کو سمجھ گئے۔

"میں جاتا ہوں" لالا نے کہا "جب تک میں نہ آؤں یہاں سے مت ہلیے گا۔"

"تمھیں نہیں معلوم پاپا کہاں ہیں۔" میں نے کہا "میں بھی تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں۔ تم اپنی ماں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گی۔" لالا نے کہا "تم میرے ساتھ رہو گی تو ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔"

رام جی لال بہت دیر کے بعد دوپہر کو لوٹا۔ "صاحب فوت ہو چکے ہیں۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ "جس وقت وہ دم توڑ رہے تھے میں اسی وقت پہنچا۔ خون اتنا بہہ چکا تھا کہ ان کا بچنا مشکل تھا۔ ان سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ لیکن انھوں نے میری طرف اس طرح سے دیکھا جیسے وہ مجھے پہچان رہے ہوں۔۔۔"

## لالا رام جی لال

لالا دوپہر کے وقت چلا گیا یہ وعدہ کر کے کہ وہ اندھیرا ہونے پر لوٹ آئے گا اور ہمیں اپنے گھر لے جائے گا۔ ایسا کرنے پر وہ ایک بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔ اس

095
www.taemeernews.com



نے ہماری حفاظت کی ذمہ داری لی تھی۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا کہ ایک بات کو اگر ٹھان لیتا تو اسے پورا کر کے ہی رہتا۔ وہ کوئی سرکاری ملازم نہیں تھا اور نہ انگریزوں کے تئیں وفاداری رکھتا تھا۔ باغیوں کے ساتھ بھی اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا، کیونکہ دونوں کے راستے الگ تھے۔ وہ اپنے دھندے سے کافی مطمئن تھا (اس کے پاس کئی پالکیاں اور گھوڑا گاڑیاں تھیں جو وہ انگریزوں کو کرائے پر دیتا تھا (کیونکہ وہ انھیں خرید نہیں سکتے تھے۔) جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا وہ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ ہر کام میں اس کا اپنا ذاتی مفاد ہوتا تھا۔ وہ ہماری مدد اس لیے نہیں کر رہا تھا کہ ہم حکمراں جماعت میں سے تھے۔ میرے والد شاہ جہاں پور میں سب سے کم رتبے کے افسر تھے۔ لالا ہمیں بہت برسوں سے جانتا تھا اور میری ماں سے تو اس کا بہت لگاؤ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اسے اپنا دوست اور برابر کا تصور کرتی تھیں۔

مجھے اب احساس ہو گیا تھا کہ میں بنا باپ کے ہوں اور میری ماں بیوہ ہو گئی تھیں۔ لیکن وہ وقت ہمارے ذاتی غم کے اظہار کرنے کا نہیں تھا۔ ہماری زندگی ہر طرف سے خطرے میں تھی۔ ہمارے اس چھپنے کی جگہ تک ہمارے اپنے جلتے ہوئے گھر سے لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔ شہر سے چھاؤنی تک جانے والی سڑک پر ہنگامہ برپا تھا اور ہر طرف لوگوں کا شور شرابہ تھا۔ ہمارے دروازے کے سامنے سے بھاری قدموں سے آتے جاتے لوگوں کی آواز ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ فقط اک آہ کی آواز یا چھینک ہمیں مصیبت میں ڈال سکتی تھی اور ہمیں بازار کے بدمعاشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتی تھی جو ہاتھوں میں ننگی تلواریں چمکاتے گھوم رہے تھے۔

اس چھوٹے سے کمرے میں ہم آٹھ افراد تھے۔ امی، دادی، میں، میری چچازاد بہن آنیٹ، میری امی کا سوتیلا بھائی پلّو جو میری ہی عمر کا تھا اور اس کی ماں، ہماری نوکرانیاں چمپا اور لاڈو۔ ان کے علاوہ ہمارے سفید اور کالے دو کتے جو امی کے پیچھے چلے آئے جیسے ہی وہ گھر سے نکلیں۔

مٹی کا یہ کچا گھر جس میں ہم پناہ گزیں ہوئے تھے ترلوکی کا تھا جو ایک راج مستری تھا اور جس نے ہمارے گھر کے بننے میں مدد کی تھی۔ ہم اسے بڑی اچھی طرح

096
www.taemeernews.com



سے جانتے تھے۔ بغاوت سے کچھ ہفتہ پہلے جب امی نوکروں سے شاہ جہاں پور میں ہنگامہ برپا ہونے کے امکانات پر بات چیت کر رہی تھیں تو ترلوکی ان لوگوں میں سے ایک تھا جس نے ضرورت پڑنے پر ہمیں اپنے مکان میں پناہ دینے کی پیش کش کی تھی۔ امی نے اس کی یہ پیش کش احتیاط کے طور پر منظور کر لی تھی اور اس سے اس کے گھر کی چابی بھی لے لی تھی۔

امّی نے بعد میں مجھے بتایا کہ اُس روز صبح وہ برآمدے میں بیٹھی تھیں تو مالی کا لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بولا : "غدر شروع ہو گیا ہے۔ صاحب اور مسی بابا قتل کر دیے گئے ہیں۔" یہ خبر سنتے ہی کہ ہم دونوں مارے گئے ہیں امّی کے دل میں جو پہلی بات آئی وہ نزدیک کے کسی کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی تھی۔ لیکن دادی نے اسے پکڑ کر اس قسم کی جلد بازی کرنے سے یہ کہہ کر روکا "تم ایسا کرو گی تو ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟" اس طرح سے وہ سڑک پار کر کے دوسرے افراد کے ساتھ ترلوکی کے گھر میں آ گئیں اور اندر آ کر دروازے کو کنڈی لگا دی۔

سارا دن ہم اس جھونپڑی میں بند رہے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا کہ جلدی ہی ہمیں کوئی ڈھونڈ نکالے گا اور ہمارا خاتمہ کر دے گا۔ پاپا کے قتل کے بعد ہمارا مستقبل اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ ہمارے لیے بات کرنا بھی مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ گرم لُو کے تھپیڑے دروازے کی دراڑوں میں سے اندر آ رہے تھے۔ ہمارے گلے پیاس سے سوکھ گئے تھے۔ بعد دوپہر جھونپڑی کے پیچھے کھڑکی کے پاس پیڑ پر سے کسی نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی لٹکائی۔ یہ مہربانی ہم پر ترس کھا کر چٹنانے کی تھی جو ہمارا مکان بنتے وقت وہاں مزدوری کیا کرتا تھا۔

دس بجے کے قریب لالا، دھنی اور ہمارے ایک پرانے خدمت گار کے ہمراہ آیا۔ اس نے ہمیں اپنے گھر پر لے جانے کی پیش کش کی۔ امّی پہلے تو باہر آنے سے ہچکچائیں۔ لالا نے یقین دلایا کہ سڑکیں بالکل صاف ہیں اور ان کے ساتھ کسی طرح کی بدتمیزی کیے جانے کا امکان نہیں ہے تو امّی آخر مان گئیں۔

ہم دو حصّوں میں بٹ گئے۔ لالا کے ایک ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور دوسرے

097
www.taemeernews.com



میں چھاتا۔ وہ آگے چل رہا تھا۔ امّی، آنیٹ اور میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اس کے پیچھے تھے۔ امّی نے ہمارے اوپر پلنگ پوش ڈال دیا جو وہ گھر سے نکلتے وقت اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ ہم بڑی سڑک کو چھوڑ کر بھنگیوں کے گھروں کے باہر سے ہوتے ہوئے پندرہ منٹ میں لالا کے گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچ کر لالا نے ہمیں ایک چارپائی پر بٹھادیا اور خود زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔

ترلوکی کے گھر سے نکلتے وقت امّی نے اپنا چابیوں کا گچھا پھینک دیا تھا۔ میں نے امّی سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے میرا دھیان آگ میں جل رہے بنگلے کی طرف دلایا اور کہا "اب وہ چابیاں بھلا ہمارے کس کام کی تھیں۔"

خدمت گار دھنی رام بھی دوسرے جتھے کے ساتھ جس میں میری دادی، پلّو اور اس کی ماں، چمپا اور لاڈو اور کتے تھے پہنچ گیا۔ لالا کے اس چھوٹے گھر میں ہم کل آٹھ افراد تھے اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس کا اپنا گھرانہ بھی اتنا ہی بڑا تھا جتنا ہمارا۔

ہمارے سامنے کھانا پروسا گیا لیکن ہم سے کھایا نہ گیا۔ رات کو ہم آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ امّی، دادی اور میں ایک بستر پر اور باقی لوگ زمین پر۔ اندھیرے میں، میں نے اپنا چہرہ ماں کے سینے کے ساتھ چپکا لیا تھا اور رو کر اپنا غم کا غبار نکال رہی تھی۔ امّی بھی آہستہ آہستہ رو رہی تھیں اور مجھے نیند آنے تک وہ روتی ہی رہیں۔

## لالا کا گھر

لالا رام جی لال کے گھر میں اس کے علاوہ، اس کی بیوی، ماں، چاچی اور بہن تھے۔ یہ گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ لالا کی طاقت اور صبر کا ایک طرح سے امتحان تھا کہ وہ بارہ بے صبر عورتوں کے بیچ رہ رہا تھا۔

لالا کے گھر والے ہم سے بخوبی واقف تھے کیونکہ لالا کی ماں اور چاچی اکثر ہمارے گھر، حوض سے پانی لینے آتی رہتی تھیں اور ہمارے گھر کے پاس ایک سمادھی پر بیل کے پتے چڑھانے بھی آتی تھیں۔ پہلے پہل تو وہ ہم سے شرما گئیں اور ہم اپنے غم

098
www.taemeernews.com



میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ مکان کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رونے لگتے۔ لالا کی بیوی پتلوں میں کھانا پروس کر ہمارے سامنے رکھتی تھی۔ چوبیس گھنٹے میں ہم فقط ایک ہی بار کھاتے تھے، وہ بھی دوپہر کے بعد۔ لیکن تھوڑا کھانا کھا کر بھی ہمیں پوری طرح تسلی ہو جاتی تھی۔

مکان وہی گارے مٹی کا بنا ہوا تھا جس میں چار کمرے تھے اور ان کے سامنے ایک برآمدہ اور پیچھے ایک صحن تھا۔ مکان بالکل سادہ اور چھوٹا تھا جس میں قلیل آمدنی والے لوگ رہتے تھے۔

لالا کی بیوی نازک قد اور اچھے نقش و نگار والی جوان عورت تھی۔ ہمیں اس کا نام معلوم نہیں تھا کیونکہ خاوند یا بیوی کو ایک دوسرے کا نام لے کر پکارنے کی روایت نہیں تھی۔ لیکن لالا کی ماں اسے دلہن کہہ کر بلاتی تھی۔

لالا خود لمبا، دبلا پتلا، بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی تھا۔ دوسرے کابستھوں کی طرح اس کی گفتگو میں بڑی شائستگی تھی۔ لیکن دوسروں کے مقابلے میں وہ ارادے کا پکا تھا۔

ہمارے آنے کے دوسرے دن میں نے اس کی ماں کو کہتے ہوئے سنا "لالا تم نے ان انگریز خواتین کو گھر میں لا کر بڑی بھاری بھول کی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ باغیوں کو جیسے ہی ان کی خبر ملے گی وہ آ کر ہم سب کو ختم کر دیں گے۔"

"میں نے جو کچھ بھی کیا ہے ٹھیک ہی کیا ہے۔" لالا نے بڑی حلیمی سے کہا۔ "میں نے ان انگریز خواتین کو پناہ دی ہے۔ میں نے اپنے دوستوں کو پناہ دی ہے۔ لوگوں کو جو کہنا ہے کہتے رہیں۔"

وہ گھر سے کہیں باہر نہیں جاتا تھا۔ ہر وقت گھر کے اگلے دروازے پر پڑا رہتا یا اپنا چھوٹا حقہ پیتا یا پھر کوئی دوست یار آ جاتا تو اس کے ساتھ چوسر کھیلتا۔ کچھ دنوں کے بعد لوگوں کو شک ہو گیا کہ لالا کے گھر میں کوئی ہے جس کی وجہ سے لالا بہت محتاط رہتا ہے لیکن کسی کو یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ یہ مہمان کون تھے۔ لالا کی چاچی نے امی کو بتایا کہ ہمارا تیسرا آقا جو ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا، ہمارے دھواں اگلتے بنگلے کے کھنڈروں

099
www.taemeernews.com



کے ارد گرد گھومتا ہوا دیکھا گیا تھا اور بغاوت کے دوسرے دن وہ اپنے مالک کے لوٹنے کے انتظار میں بیٹھا بیٹھا مر گیا تھا۔

ایک دن لالا جب آیا تو ہم فرش پر بیٹھے موجودہ حالات کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ آنے والے کل کی فکر نے ہمارے موجودہ غم کو بھلا دیا تھا۔ ہم نے بغیر روئے دھوئے سارا واقعہ بیان کر دیا۔

لالا ہاتھ میں کھلی ہوئی تلوار لیے زمین پر بیٹھ گیا۔ یہ تلوار اس کے لیے ایک لازمی ہتھیار بن گیا تھا۔ لیکن میرے خیال میں ابھی تک اسے اس ہتھیار کو استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یہ تلوار اس کی اپنی نہیں تھی اور اس کو لوٹ مار کے بعد کچہری میں فرش پر پڑی ملی تھی۔

''لالا کیا ہم تمھارے گھر میں محفوظ ہیں؟'' امّی نے پوچھا۔ ''آج کل باہر کی کیا خبر ہے؟''

''یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔'' لالا نے تلوار گھماتے ہوئے کہا ''اس گھر میں کسی کے آنے کی ہمت نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں کوئی آئے گا تو میری لاش پر ہو کر آئے گا۔ اس میں جھوٹ نہیں کہ میں نے کافروں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ کئی لوگ مجھ سے پوچھ چکے ہیں کہ میں اپنے گھر پر کڑی نظر کیوں رکھے ہوئے ہوں۔ میرا جواب ہوتا ہے کہ چونکہ بغاوت نے میرا دھندہ چوپٹ کر دیا ہے اس لیے میرے پاس گھر بیٹھے اپنی عورتوں کی حفاظت کرنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے۔ وہ پھر پوچھتے ہیں کہ میں دوسرے لوگوں کی طرح نواب کے پاس کیوں نہیں گیا۔''

''کون سا نواب۔ لالا؟'' امّی نے پوچھا۔

''سپاہیوں کے شہر میں داخل ہونے کے بعد اُن کے سردار صوبے دار میجر نے قادر علی خان کو نواب کی گدی پر بٹھا دیا اور سارے شہر میں اس کی ڈونڈی پٹوا دی۔ نظام علی کو جو کہ پنشن خوار تھا کوتوال بنا دیا گیا۔ کچھ اور ذمے دار عہدے جاوید خان اور نظام علی خان کو بھی دیے گئے لیکن نظام علی خان نے ان عہدوں کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔''

100
www.taemeernews.com



''اور جاوید خان۔۔۔؟''

''اس نے بھی ابھی کوئی عہدہ نہیں سنبھالا کیونکہ وہ ازو خان کے ساتھ مل کر صاحب لوگوں کے مکانوں کی لوٹ مار میں لگا ہوا تھا۔ جاوید نے ہی خزانچی پر حملے کے لیے اکسایا تھا۔ وہ اس طرح سے ہوا۔۔۔

''آپ جانتی ہیں کہ جاوید شہر کا ایک بڑا غنڈا ہے۔ نئے نواب کو گدی پر بٹھانے کے بعد سپاہی جب اپنی بارکوں میں لوٹے تو جاوید ان کے کمانڈر سے ملا۔ اسے جب اس بات کا علم ہوا کہ رجمنٹ شاہ جہاں پور چھوڑ کر بریلی برگیڈ میں شامل ہونے جا رہی ہے تو اس نے صوبہ دار میجر گھنشام سنگھ کو جانے سے پہلے روز آرم فیکٹری پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا۔ صوبہ دار نے زور آور سنگھ کی قیادت میں ایک مہم جاوید کے ہمراہ کی اور وہ اس سڑک پر آ گئے جو جھنہ لال خزانچی کے گھر کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہاں رُک کر انھوں نے جھنہ لال سے کچھ رقم طلب کی۔ جھنہ لال کو اسی صبح جلال آباد کے تحصیل دار سے چھ ہزار روپے وصول ہوئے تھے۔ صوبہ دار نے فوراً ہی یہ روپے اس سے چھین لیے۔ جھنہ لال نے مزید رقم دینے سے جب انکار کر دیا تو اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے درخت سے لٹکا دیا گیا۔ اسی وقت جاوید خان نے اس کے بہی کھاتے اٹھا کر کنویں میں پھینک دیے اور کہا ''تم نے چونکہ ہمیں روپیہ دینے سے انکار کیا ہے تو یہ رہے تمھارے حساب کے بہی کھاتے۔ اب تم اوروں سے اپنا روپیہ وصول نہیں کر پاؤ گے۔''

اُن کے جانے کے بعد جھنہ لال کے نوکر نے اُسے درخت سے نیچے اتارا۔ خوف کے مارے وہ نیم مردہ ہو گیا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن جونہی اسے ہوش آیا اس نے اپنے نوکروں سے کنویں میں اتر کر تمام کتابیں نکال لانے کے لیے کہا۔

''آرم فیکٹری کا کیا انجام ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''جاوید خان کے آدمیوں نے اس میں آگ لگا دی۔ کم سے کم ستر ہزار گیلن رم کے اور بڑی تعداد میں گڑ کے ڈھیلے برباد ہو گئے۔ باقی جو بچا لوگوں نے لوٹ لیا۔

101
www.taemeernews.com



جاوید خان کے حصے میں بھی گڑ کی بھیلیوں کا بھرا ہوا ایک تھیلا آیا۔"

اگلے روز جب لالا ہمارے پاس آکر بیٹھا، وہ اکثر ہر روز ہمارے پاس ایک گھنٹہ گزارا کرتا تھا، میں نے اس سے ایک سوال پوچھا جو مجھے ایک عرصے سے پریشان کر رہا تھا اور میں اس کا جواب سننے سے خوف زدہ بھی تھی۔ "میرے پاپا کی لاش کا کیا ہوا؟

"میں نے تمھیں پہلے ہی بتادیا ہوتا مسی بابا لیکن میں تمھیں پریشان کرنے سے ڈر رہا تھا۔ جس دن میں آپ لوگوں کو اپنے گھر لے کر آیا تھا تب میں دوبارہ گرجا گھر گیا تھا۔ وہاں میں نے تمھارے پاپا، کلکٹر صاحب، ڈاکٹر کی لاشوں کو پڑا ہوا پایا تھا۔ بالکل اسی جگہ جہاں میں پہلے چھوڑ کر آیا تھا۔ اتنی گرمی اور لو کے باوجود بھی لاشوں کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ نا ہی گدھوں یا بھیڑیوں نے انھیں چھوا تھا۔ فقط ان کے جوتے غائب تھے۔

"جوں ہی میں وہاں سے مڑا دو مسلمان کپتان جیمز کی لاش کو اٹھا کر لا رہے تھے، جو گرجا گھر سے کچھ دوری پر گولی لگنے سے مرا ہوا پڑا تھا۔ اس لاش کو بھی انھوں نے تمھارے پاپا اور باؤلنگ کی لاشوں کے پاس رکھ دیا اور مجھ سے کہا کہ انھوں نے مارے گئے عیسائیوں کی لاشوں کو دفنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسا کر کے وہ خطرہ مول لے رہے ہیں، کیونکہ نواب کے آدمی ان پر فرنگیوں سے ہمدردی رکھنے کا الزام لگائیں گے۔ انھوں نے مانا کہ وہ ایسا کرنے سے خطرہ مول لے رہے ہیں لیکن ان کے ضمیر نے انھیں اس کام کا بیڑا اٹھانے کے لیے اکسایا ہے اور وہ اس کا نتیجہ بھی بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔

"مجھے ان کا ارادہ جان کر بڑی ندامت ہوئی۔ میں نے اپنا لمبا کوٹ اتار پھینکا اور لاشوں کو اٹھا کر اس گڈھے میں ڈالنے میں، جو انھوں نے گرجا گھر کے باہر کھودا تھا، میں ان کی مدد کرنے لگا۔ یہاں میں نے مسٹر میک فلام، پادری صاحب اور نائب کلکٹر مسٹر اسمتھ کی لاشوں کو بھی پہچان لیا۔ سبھی چھ لاشوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دفنادیا اور قبر کو ایک بڑے پتھر سے ڈھک کر اس پر متوازی لائنیں کھینچ دیں تاکہ چھ قبریں الگ الگ لگیں۔ یہ کام ایک گھنٹہ میں ختم ہو گیا اور جب میں اس جگہ سے ہلا تو

102
www.taemeernews.com



میرے دل کو تسلی ہوئی جس کا میں بیان نہیں کر سکتا۔۔۔"

رام جی لال کا بیان سن کر جو نزع ہم پر طاری ہوئی تھی اس سے ہوش میں آنے پر میں نے پھر اس سے پوچھا کہ مسٹر میک فلام پادری کی موت کس طرح واقع ہوئی کیونکہ جب بدمعاش گرجا گھر میں گھس آئے تھے میں نے پادری کو ممبر سے نیچے اتر کر مسٹر رِکٹ کی ماں کے ساتھ توشہ خانے سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اس بارے میں آپ کو تفصیل سے کچھ نہیں بتا سکتا" لالا نے کہا "میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب باغیوں نے مسٹر رِکٹ پر حملہ کیا تو مسٹر میک فلام خربوزے کے کھیتوں میں پہنچ گیا تھا اور بیلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا لیکن ایک دوسرے گروہ نے اسے ڈھونڈ نکالا اور تلواروں سے اس کا قتل کر دیا۔

"بچارہ مسٹر میک فلام!" امّی نے آہ بھر کر کہا "وہ بچارہ تو بڑا اچھا آدمی تھا جو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا اور آرتھر اسمتھ کے ساتھ کیا بیتی لالا؟" امّی ہر اس آدمی کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں جن کو ہم جانتے تھے۔

"نائب صاحب کا قتل شہر میں ہوا تھا۔" لالا نے کہا "ہنگامے کے وقت وہ اپنے بنگلے پر بیمار پڑا تھا۔ اس نے چھاؤنی چھوڑ کر شہر میں جانا زیادہ محفوظ سمجھا اس خیال سے کہ بغاوت میں صرف سپاہی ہی شامل تھے۔ وہ کچہری میں گیا جو ایک قتل گاہ بن چکی تھی۔ جیسے ہی گلی میں مڑا کہ بھیڑ کے ایک ریلے نے اسے گھیر لیا اور دھکیلنے لگے۔ ایک آدمی اپنی تلوار کے ہتھے سے اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ مسٹر اسمتھ کو غصہ آگیا اور بخار ہونے کے باوجود بھی اس نے اپنی پستول ایک آدمی پر داغ دی مگر افسوس کہ پستول کا ڈھکن نہیں کھلا اور اس کا وار خالی گیا۔ اس نے ایک بار پھر نشانہ باندھا مگر گولی اس آدمی کی پیٹی کے کندے سے ٹکرا کر زمین پر آگری۔ ناامید ہو کر مسٹر اسمتھ نے پستول پھینک دی۔ وہ آدمی اب مسٹر اسمتھ پر تلوار کے وار کر رہا تھا اور مسٹر اسمتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ اب بھیڑ اس پر ٹوٹ پڑی۔ قسمت نے اسمتھ صاحب کا ساتھ نہیں دیا۔ کمپنی بہادر کی عزت مٹی میں مل گئی۔ کسی نے کبھی پستول کو بند ہوتے سنا تھا یا گولی کو پیٹی کے کندے سے لگ کر وار بیکار ہوتے دیکھا تھا؟"

103
www.taemeernews.com



# نام کا بدلنا

رام جی لال کے ذریعہ جو خبریں ہم تک پہنچ رہی تھیں، اُن سے تو ایسا لگتا تھا کہ جون کا آدھا مہینہ بیتنے تک شاہ جہاں پور میں مقیم ہر یورپی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اگر شہر میں نہیں تو دریائے کھنٹ کے اس پار محمدی میں جہاں مسز باولنگ اور اس کی بچی بھاگ کر چلے گئے تھے۔ بچنے والوں میں سے صرف ہم تھے اور (جیسا کہ ہمیں بعد میں پتہ چلا) ریڈ مین کا گھرانہ اور ہم بھی اسی لیے بچ گئے تھے کہ دنیا شاید یہی سمجھتی تھی کہ ہم ختم ہو چکے ہیں۔ یہ بات بھی ہم پر تب واضح ہوئی جب مچھلی بیچنے والی ایک عورت ہمارے دروازے پر آئی۔

لالا کی بیوی نے اس سے کہا : ''تم بہت دن بعد آرہی ہو اور آج تو تم نے ابھی تک کچھ بیچا بھی نہیں۔''

''اوللائن!'' عورت نے کہا ''اب خریدار ہی نہیں۔ فرنگی تو چلے گئے۔ ایک وقت تھا جب میں لباڈور کے ہاں ہر روز جاتی تھی اور چار پانچ آنے کما کر ہی اٹھتی تھی۔۔ میم صاحب مجھ سے مچھلی خریدتی ہی نہیں تھیں بلکہ کبھی کبھی تو مجھے پکانے کے لیے بھی کہتی تھیں جس کے لیے مجھے دو آنے فالتو دے دیتی تھیں۔''

''ان کے ساتھ کیا بیتی؟'' للائن نے پوچھا۔

''صاحب اور ان کی لڑکی کو گرجا گھر میں ہی قتل کر دیا گیا تھا جبکہ میم صاحب نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔''

''نہیں۔ یقین کے ساتھ کہہ رہی ہو؟'' للائن نے پوچھا۔

''بالکل!'' عورت نے کہا ''میرے خاوند نے اگلی صبح جب وہ کھنٹ میں مچھلی پکڑنے گیا تھا اس کی لاش کو بہتے دیکھا تھا۔''

لالا رام جی لال کے ہاں آئے ہمیں دو ہفتے ہو چکے تھے۔ اتنے دنوں میں ہمارے کپڑے گندے ہو گئے تھے اور پھٹ بھی گئے تھے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا

104
www.taemeernews.com



کہ ہم گھر سے کچھ کپڑے اٹھا لیتے۔ اس لیے کپڑے بدلنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا جب تک کہ ہم ہندوستانی پہناوے کو اپنا نہ لیتے۔ امّی نے للائن کے کچھ جوڑے پیٹی کوٹوں کے بدلے اور چند شالیں اُدھار لیں اور اُنھیں ہمارے ناپ کے مطابق سی دیا۔ جب میلے ہو جاتے تو ہم انھیں صحن میں بیٹھ کر دھو ڈالتے اور بدن پر چادر وغیرہ لپیٹ لیتے جب تک کہ کپڑے آدھے سوکھ نہیں جاتے۔

امّی نے ہمیں ہندوستانی نام دینے میں بھی مصلحت سمجھی۔ میرا نام خورشید رکھا فارسی میں جس کا مطلب سورج ہے اور میری چچازاد بہن کو اس کے ناٹے قد کی وجہ سے ننھی کا نام دیا گیا۔ پلّو کا نام غلام حسین ہو گیا اور اس طرح سے اس کی ماں کو غلام حسین کی ماں کہہ کر پکارا جانے لگا۔ نانی تو بڑی بی تھیں ہی۔ چونکہ ہم اچھی خاصی اردو بول لیتے تھے اس لیے ہمیں مسلم نام دیے گئے اور نانی تو رامپور کے مسلم گھرانے میں سے ہی تھیں۔ ہم جلد ہی لالا کے گھر میں رچ بس گئے اور وہ لوگ جو ہمیں پہلے سے جانتے تھے اور لباڈور گھرانے کے افراد میں شمار کرتے تھے اب ان کے لیے بھی ہمیں پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔

لالا کے گھر میں اچھی خاصی مستی کا عالم تھا۔ وہاں لالا کا ایک رشتہ دار امرت لال اپنی بیوی رتنا کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ چھوٹے قد کا گٹھا ہو آدمی تھا۔ اس کی بیوی دراز قد لیکن بدصورت تھی۔ اُس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد وہ ایک نیچ ذات کی عورت کے چکر میں پھنس گیا جو ان کے یہاں پانی بھرتی تھی اور اسی کی طرح ناٹے قد کی مضبوط عورت تھی۔ اس عورت سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اولاد کی تمنا تو اس کی پوری ہو گئی لیکن سوکنوں کی آپس کی لڑائی میں اُس کا امن چین جاتا رہا۔ پیشے سے وہ جیوتشی تھا۔ ایک دن اس نے اپنے نکشتروں کا حساب لگایا اور گھر بار چھوڑ کر کسی دوسری جگہ قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس کی دونوں بیویاں چونکہ اب اکیلی رہ گئی تھیں اس لیے آپس میں صلح صفائی کر کے اکٹھا رہنے لگیں۔ پہلی بیوی سینے پرونے کا کچھ کام کر کے کما لیتی تو دوسری چکّی چلا کر۔ اکثر ان میں حسد کی وجہ سے جھگڑا ہو جاتا۔ دوسری بیوی پہلی کو بانجھ ہونے کے طعنہ دیتی تو درزیانی جواباً کہتی جب تو پانی کھینچتی تھی

105
www.taemeernews.com



تیرے ہاتھ پاؤں میں چھالے پڑگئے تھے۔ اب جب تو پسائی کا کام کرتی ہے تو تیری انگلیاں بھی چھالوں سے بھر گئی ہیں اور کہاں کہاں چھالے چاہئیں تجھے؟

اسی اثنا میں امرت لال یوگی ہو گیا تھا اور جیوتش لگاتا تھا اور ہری دوار میں آرام کی زندگی گزار رہا تھا۔ اُس کا جب کچھ اتا پتا لگا تو دوسری بیوی نے ایک عرضی نویس سے اس کے نام ایک خط لکھوایا اور چونکہ میں اردو جانتی تھی مجھ سے پڑھنے کو کہا۔ خط کچھ اس طرح سے تھا :

"تم تو ایسے غائب ہوئے جیسے جسم سے سرسوں کا تیل غائب ہو جاتا ہے اور اپنی خوشبو چھوڑ جاتا ہے۔ تم اپنے گول مٹول جسم کے ساتھ میرے آگے پیچھے ناچا کرتے تھے۔ تمھاری اُلو کی سی آنکھیں عادتاً مجھے ڈھونڈا کرتی تھیں۔ میرا دھیان اب بھی تمھاری طرف ہے اور یہ خط پاکر بھی کیا تم میری طرف سے غافل رہو گے؟ تم مجھ کو لاڈو، محبوبہ کہہ کر پکارتے تھے۔ کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ تم مجھے اس سوکھی لکڑی کی سی عورت کے طعنے سننے کے لیے کیوں چھوڑ گئے۔ وہ عورت جسے تم کجروی سے قیمتی پتھر سمجھ کر رتنا کہتے تھے؟ بے وفا کون نکلا تم یا میں؟ تم نے جذبات کے ساتھ یہ کھلواڑ کیوں کی؟ چلّو بھر پانی میں ڈوب مرو یا واپس آکر میری حاسد کو اپنے گلے کا ہار بنالو یا اپنے بازو پر اس کی موت کا تعویذ بناکر باندھو تاکہ تمھارے لیے میری محبت کو وہ نہ چھین سکے۔"

اس خط کا اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید اُس نے پھر نجوم لگایا ہو گا اور اپنی بیوی بچّوں کو رام جی لال جیسے فیاض رشتہ دار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پہاڑوں پر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔

گرمی اپنے پورے شباب پر تھی اس لیے لالا اور اس کے گھر والے سبھی باہر صحن میں ہی سوتے تھے۔ ہم بھی کافی لوگ تھے۔ امّی کے علاوہ باقی لوگ تو اچھی طرح سوتے تھے۔ امّی چاہے دن میں آرام کر لیتی تھیں لیکن ہماری خاطر راتیں جاگ کر ہی

106
www.taemeernews.com



کاٹتی تھیں۔ رات رات بھر انھیں جاگتے دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا۔ خطرے کا خیال ان کے دل میں پہلے جیسا ہی بنا ہوا تھا۔ لالا ہاتھ جوڑ کر ان سے التجا کرتا "مریم۔ تم سو جاؤ۔ ارے میں ماتھر نہیں اگر آپ لوگوں کا دھیان نہ رکھوں۔" لیکن امّی نے لالا سے صرف ایک چاقو مانگا جسے وہ اپنے سرہانے رکھنا چاہتی تھیں۔ لالا نے انھیں ایک زنگ آلود چاقو تھمادیا جسے صاف کرنے اور دھار لگانے میں امّی نے بڑی محنت کی۔

اور ایک دن آگیا جب امّی نے چاقو استعمال کرنے کی دھمکی دی۔ رات کے دس بجے تھے۔ امّی کے علاوہ سبھی لوگ سوگئے تھے اور وہ میری چارپائی کی پائینتی پر بیٹھی تھیں۔ مجھے نیند کے جھونکے آہی رہے تھے کہ امّی نے کہا کہ انھیں چمیلی کے پھولوں کی خوشبو آرہی ہے جبکہ گھر کے نزدیک کہیں بھی چمیلی کا پودا نہیں تھا۔ اسی وقت اونچی دیوار سے مٹّی کا ایک ڈھیلا گرا اور جیسے ہی ہم نے اوپر دیکھا ایک آدمی دیوار پر بیٹھا تھا۔ ایک اور آدمی تھوڑی دوری پر صحن میں لگے نیم کے درخت کے سائے میں چھپا ہوا تھا۔ امّی نے تکیے کے نیچے سے اپنا چاقو نکال لیا اور للکار کر کہا کہ اگر کسی نے ہمیں ہاتھ بھی لگایا تو وہ چاقو اس کے سینے میں گھونپ دے گی۔ اپنے بچّوں کی حفاظت کر رہی شیرنی کی طرح امّی کے خون آشام ارادے سے گھبرا کر گھس بیٹھیے چپکے سے رات کے اندھیرے میں غائب ہوگئے۔

اس واقعہ نے ہمیں یہ یقین دلادیا کہ لوگوں کو ہمارے وجود کا علم ہے اور ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ کچھ دن بعد ایک اور بات ہوئی جس نے ہمیں اور بھی زیادہ گھبرادیا۔

ہماری ایک نوکرانی لاڈو جو ہمارے ساتھ آئی تھی لالا کی اجازت سے ایک کونے میں پناہ گزیں تھی۔ اس کی لڑکی کی شادی تلواریں تیز کرنے والے ایک شخص سے ہوئی تھی اور وہ بغاوت کے دن سے اسے ادھر ادھر تلاش کر رہا تھا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ لالا کے گھر میں کچھ فرنگی ٹھہرے ہوئے ہیں تو وہ 23 جون کو لالا کے گھر پر آگیا اور بولا : "مجھے پتہ چلا ہے کہ میری ساس تمھارے گھر میں ہے۔ میں نے ہر جگہ اس کا پتہ لگایا اور لوگوں نے بتایا کہ انھوں نے اسے ادھر ہی آتے دیکھا تھا۔ اچھا تو یہ

107
www.taemeernews.com



ہوگا لالا جی کہ اُس کو میرے ساتھ بھیج دو ورنہ میں تمھارے لیے مصیبت کھڑی کردوں گا۔"

لالا نے لاڈو کے بارے میں کچھ کہنے سے انکار کردیا تو وہ آدمی گھر کی تلاشی لینے پر بضد ہو گیا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے" لالا نے کہا۔ "ارے بد تمیز چلا جا یہاں سے۔ میرے زنانہ میں داخل ہونے کی بات کہنے کی تو نے ہمت کیسے کی؟"

وہ آدمی غصہ میں واپس چلا گیا۔ اُس نے دھمکی دی کہ وہ نواب سے کہہ کر سپاہیوں کو پھر لے کر آئے گا۔ لاڈو کو جب اس بات کو پتہ چلا تو وہ کمرے میں آکر امّی کے پاؤں پر گر گئی اور کہا کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی تاکہ اس کا داماد کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کردے۔ وہ میرے لیے اور چچازاد بہن کے لیے دُعا دیتی روتی ہوئی چلی گئی۔ بچاری لاڈو! وہ کئی سالوں سے ہمارے پاس تھی اور ہم سب اسے چاہنے لگے تھے۔ ہماری مصیبت کے دنوں میں اپنی وفاداری کا ثبوت دے کر اس نے ہمارے دلوں کو جیت لیا تھا۔

شام کو جب لالا گھر لوٹا تو اس نے ہمیں بتایا کہ لاڈو پر کیا بیتی۔ وہ شہر میں اپنے داماد کے ہاں گئی تھی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں اماں؟" اس نے پوچھا۔ "میں ہر جگہ تمھیں تلاش کر رہا تھا۔ تم اچانک کہاں سے آ ٹپکیں؟"

"میں ابھی ابھی فتح گڑھ سے آرہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"کیا ماں، فتح گڑھ میں بھلا کیا لینے گئی تھیں؟ اور ان انگریزوں کا کیا ہوا جن کے ہاں تم کام کرتی تھیں؟"

"ارے بھئی، مجھے کیا معلوم ان کا کیا ہوا۔" لاڈو نے کہا "میرا خیال ہے وہ تو سب مارے گئے تھے۔ ایک آدمی نے تو لباڈور میم صاحب کو کھنات میں ڈوبتے بھی دیکھا تھا۔"

نواب نے ہماری اس پرانی نوکرانی کا اچانک آنے کا سنا تو اس نے اسے بُلا بھیجا

108
www.taemeernews.com



اور اچھی طرح سے اس سے سوال جواب کیے لیکن لاڈو یہی رٹ لگائے رہی کہ وہ کچھ نہیں جانتی کہ ہمارے ساتھ کیا بیتی۔

نواب نے اسے برا بھلا کہا۔ ”یہ نامراد میرے سامنے جھوٹ بول رہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اسے سب معلوم ہے کہ کون کہاں ہے لیکن بتائے گی نہیں۔ قسم خدا کی، اگر تم مجھے ان کے بارے میں سب کچھ نہیں بتادوگی تو میں تمھارا سر قلم کردوں گا۔ سُنا تم نے؟“

”میرے آقا!“ لاڈو نے سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے کہا۔ ”جس چیز کا مجھے علم نہیں وہ میں آپ کو کیسے بتا سکتی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ جب ان کا مکان جل رہا تھا تو میں بھی ان کے ساتھ ہی وہاں سے نکلی تھی مگر اس کے بعد وہ لوگ کہاں گئے، مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

”یہ شیطان کی اولاد!“ نواب نے غصّے سے کہا۔ ”یہ مجھے زیادتی کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ یہ سچائی کو چھپا رہی ہے۔ اچھی بات ہے اسے اپنی کرنی کی سزا ملنی ہی چاہیے۔“

دو آدمیوں نے بھاگ کر لاڈو کے بال پکڑ لیے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ دی۔ بیچاری کو ان دونوں کی پکڑ سے تکلیف ہو رہی تھی اور وہ اپنی معصومیت کا اظہار کرتے ہوئے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔

”مجھے آپ کے سر کی قسم آقا میں کچھ نہیں جانتی۔“

”تو میرے سر کی قسم بھی کھانے لگی۔“ نواب نے آگ بگولہ ہو کر کہا۔ ”اچھا تو، تو اس تلوار سے بھی نہیں ڈرتی، ظاہر ہے تجھے کچھ نہیں معلوم، چھوڑ دو اسے۔“

اور بیچاری لاڈو کو جو خوف سے نیم مردہ ہو گئی تھی رہا کر دیا گیا اور اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

109
www.taemeernews.com



# ایک دوسرا نواب

24 جون کو ڈھول پیٹے جا رہے تھے اور دور کہیں سے آرہیں ڈھول اور بانسری کی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ فساد شروع ہونے کے بعد سے یہ جانی پہچانی آوازیں سنائی دینا بند ہو گئی تھیں اور اب ہم حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سڑک پر خوب ہنگامہ برپا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔ ہم بے تابی سے لالا کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ معاملہ کا کچھ پتہ چلے۔

''کوئی دوسرا نواب آرہا ہے کیا؟'' امّی نے پوچھا۔ ''ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غلام قادر خان سابق نواب سے مختلف نہیں ہے اور پھر دونوں ایک ہی خاندان سے ہیں۔ دونوں ہی کمپنی کی حکومت کے خلاف تھے۔ فرق اتنا ہے جہاں قادر علی عیاش و آوارہ اور نااہل ثابت ہوا ہے، وہاں غلام قادر میں قوت ہے اور پرہیزگاری بھی ہے۔ لیکن اس نے بھی فرنگیوں کو اس سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ بنا رکھا ہے۔۔۔''

''غدر شروع ہونے کے وقت وہ اودھ میں تھا جہاں وہ گاؤں کے لوگوں کو غیر ملکی جوا اتار پھینکنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ وہ قادر علی کے ساتھ مل کر یہ کام کر سکتا تھا اگر ان میں نااتفاقی نہ ہوتی۔ غلام قادر عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کے خلاف تھا لیکن قادر علی نے اس کی نہ چلنے دی اور غلام قادر کچھ عرصہ کے لیے اس سے الگ ہو کر حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ اب بہت سے طاقتور زمیندار، نظام علی خان، وٹل سنگھ، عبدالرؤف اور وہ بدمعاش جاوید سب اس کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ کل وہ شاہجہاں پور میں داخل ہوا اور حکمراں بن بیٹھا۔ آج صبح مشہور باغی نے نواب کے دربار میں پیش ہوئے ہیں اور آج رات نواب نے جشن کا انتظام کیا ہے۔''

''تمھارا کیا خیال ہے لالا۔ وہ ہمیں پریشان تو نہیں کرے گا؟'' نانی نے متفکرانہ انداز سے پوچھا۔ ''ہم غریب لوگوں کو قتل کر کے اسے کیا ملے گا؟''

110
www.taemeernews.com



"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، بڑی بی۔" لالا نے کہا" سابق نواب کی طرح وہ بھی چند کافروں کو تہہ تیغ کر کے شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن شہر میں یہ خبر بھی مشہور ہے کہ وہ کسی گہرے غم میں ڈوبا ہوا ہے۔۔۔"

"کیا غم؟" امّی نے پوچھا۔ "اس کی بیوی مر گئی ہے کیا؟ اب جبکہ وہ نواب کی گدی پر بیٹھ گیا ہے تو دوسری شادی کر سکتا ہے اور پھر اس کے غم سے ہمیں کیا مطلب؟"

"غم اس کے ارادوں پر اثر تو ڈال سکتا ہے۔" لالا نے کہا۔ "افواہ تو یہ بھی ہے کہ اس کی خوبصورت جوان لڑکی کو اغوا کر لیا گیا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں پر ہے۔"

"اور اس کا عاشق؟" امّی جو دوسروں کے عاشقانہ معاملوں میں دلچسپی رکھتی تھیں، تجسس سے پوچھا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ قادر علی کا ایک بیٹا فرحت بھی اسی وقت غائب ہو گیا تھا۔ شبہ یہی ہے کہ وہی لڑکی کو لے کر بھاگا ہے۔"

"اوہ! فرحت کو میں جانتی ہوں۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان ہے جو اکثر ہمارے گھر کے سامنے سے چتکبرے گھوڑے پر سوار ہو کر گزرتا تھا۔ خیر ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا مریم۔" لالا نے کہا۔ "جیسے ہی نواب نے گدی سنبھالی اور دربار لگایا تو کچھ مخبروں نے اسے لاڈو کی کہانی سنائی اور مشورہ دیا کہ تم لوگ میرے گھر میں چھپے ہوئے ہو، اس لیے میرے گھر کی تلاشی لی جائے۔ نواب خود بھی لباڈو صاحب کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کیونکہ صاحب اس کی نظروں میں بے ضرر و مسکین شخصیت کے آدمی تھے۔ اُسے جب یہ بتایا گیا کہ صاحب قتل کر دیے گئے تھے تو نواب نے کہا کہ ٹھیک ہے تو ہمیں اب ان کی عورتوں کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں معصوم لوگوں کے قتل میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔"

"لیکن اس کے اس مزاج پر کب تک اعتبار کیا جا سکتا ہے؟" امّی نے کہا۔

111
www.taemeernews.com



''نظام علی خان نے مجھے بتایا کہ نواب نے اپنی لڑکی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فرنگیوں کی عورتوں اور بچّوں پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ ہے تو یہ ناممکن سی بات، لیکن میرے خیال میں نظام علی کی اطلاع قابل یقین ہوتی ہے۔''

''یہ تو سچ ہے۔'' امّی نے کہا۔ ''میرے خاوند اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ کئی سالوں تک اس کا صحن ہمارے قبضے میں تھا اور ہم باقاعدہ اس کا کرایہ دیتے تھے۔''

''خیر نواب اب بھی اسے پسند کرتا ہے۔'' لالا نے کہا۔ ''اس نے اسے اپنے ذاتی اسلحہ خانے میں بندوقیں بنانے کا کام دیا ہے۔ اگر نواب نظام علی جیسے آدمیوں پر بھروسہ رکھتا ہے تو قادر علی خان کے مقابلے میں وہ عوامی مسائل کی طرف اچھی طرح سے دھیان دے سکتا ہے۔''

ہم اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لیے لالا پر منحصر تھے اور امّی کے پاس اگرچہ اس کے زیوروں کے بکسے میں کچھ روپیہ تھا جو وہ اپنے ساتھ لائی تھیں تاہم وہ اس روپے کو بڑی کنجوسی سے خرچ کرنا چاہتی تھیں۔

ایک دن لالا نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''مریم مجھے کہتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ میرے پاس اب روپیہ پیسہ نہیں رہا۔ دھندا تو چوپٹ ہو گیا ہے، اور جتنا روپیہ میں نے بچا کر رکھا ہوا تھا۔ سارا ختم ہو گیا ہے۔''

''پریشان مت ہو لالا'' امّی نے کہا اور صندوقچی میں سے سونے کا ایک پترا نکال کر اس کو دیا۔ یہ سونا بازار میں لے جاؤ اور جو کچھ بھی ملے، اتنے میں اسے بیچ آؤ۔''

لالا کو کچھ شرمندگی محسوس ہوئی۔ لیکن اچانک اس مدد کے ملنے پر اسے مسرّت بھی ہوئی۔

''میں ابھی بازار جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اس سونے کا کتنا روپیہ ملتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن مریم میرا ایک مشورہ بھی ہے۔ ہم سب بریلی چلے چلیں۔ وہاں پر میرا ایک بھائی ہے اور تمھارے بھی کچھ رشتہ دار ہیں وہاں۔ کم از کم وہاں ہم مکان کا کرایہ دینے سے تو بچ جائیں گے جو یہاں دے رہے ہیں۔ اگر تمھیں منظور ہے تو میں دو گاڑیاں کرائے پر لے لیتا ہوں اور ہم سب اس میں سما جائیں گے۔''

112
www.taemeernews.com



ہم سب کو لالا کے مشورے سے اتفاق تھا اور وہ خوشی خوشی بازار کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ ہماری حفاظت کے لیے اس کے منصوبوں پر پانی پھر جائے گا۔

## آخر پکڑے گئے

ہم لگ بھگ ایک ماہ تک لالا کے گھر میں رہے اور آج اس کے یہاں ہمارا آخری دن تھا۔ حسبِ معمول ہم سب لوگ ایک ہی کمرے میں بیٹھے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ باہر سے ہمیں کچھ آوازیں سنائی دیں۔

"دروازہ کھولو!" کوئی باہر سے چلا رہا تھا اور زور زور سے صدر دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا اور گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ لالائن جو ہمارے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی اور باہر سے دروازہ پر کنڈی چڑھا دی۔

"کھولو، نہیں تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔" باہر سے آواز آئی اور دستک پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔

آخر کار رتنا نے صدر دروازہ کھول دیا۔ بیس تیس آدمی تلواروں اور پستولوں سے لیس اندر گھس آئے۔ ایک آدمی نے جو غالباً باہر زیادہ شور کر رہا تھا اور ان کا سردار تھا، عورتوں کو چھت پر جانے کا حکم دیا کیونکہ وہ بھگوڑی فرنگی عورتوں کو ڈھونڈنے کے لیے باقی سبھی کمروں کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ لالا کے گھر والوں کے پاس چھت پر جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لوگ اب ہمارے دروازے کی طرف بڑھے اور کنڈی کھول دی۔ گروہ کا سردار دھماکے سے دروازہ کھول کر ہاتھ میں ننگی تلوار لیے کمرے میں گھس آیا۔

"لباڈور کی بیٹی کہاں ہے؟" اس نے امّی کے بازو کو زور سے پکڑتے ہوئے کہا

113
www.taemeernews.com



اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں۔ یہ وہ نہیں ہے۔'' اس نے ہاتھ چھوڑ دیا اور میری طرف گھورنے لگا۔

''یہ رہی وہ لڑکی!'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر امّی کے پاس سے گھسیٹتا ہوا باہر صحن میں روشنی میں لے آیا۔ تلوار اس کے دائیں ہاتھ میں اٹھی ہوئی تھی۔

''نہیں۔۔۔'' امّی میرے آگے آکر کھڑی ہو گئیں اور کرب انگیز آواز میں چلائیں۔ ''میری بیٹی کی جان لینے سے پہلے تمھیں مجھے قتل کرنا ہوگا۔ میں علی کی تلوار کی قسم کھا کر کہتی ہوں!''

امّی کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور ڈیلے باہر نکل آئے تھے۔ وہ شاہانہ اور غضبناک لگ رہی تھی۔ امّی کو دیکھ کر مجھے اس آدمی کی ننگی تلوار سے زیادہ ڈر لگ رہا تھا لیکن میں قصداً اس کے ساتھ چپکی رہی اور اس آدمی کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ امّی کے جذبے سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے تلوار نیچے گرا دی اور ترش روئی سے ہمیں اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا اگر ہمیں اپنی جانیں پیاری ہیں تو۔ نانی ناامیدی میں اپنے ہاتھ مل رہی تھیں جبکہ دوسری عورتیں ایک کونے میں دبکی رہیں اور پلو جو اکیلا لڑکا تھا کو اپنی اوڑھنیوں میں چھپائے رکھا۔ وہ تلوار دھاری آدمی، امّی اور مجھ کو گھر سے باہر لے آیا۔ اس کے پیچھے اس کے حواری بھی آگئے۔

جون کے مہینے کا آخر تھا لیکن مانسون کی بارش کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ دوپہر ہونے کو تھی اور سورج بڑی شدت سے گرمی برسا رہا تھا۔ زمین سخت خشک اور گرد آلود ہو رہی تھی۔ ننگے پاؤں اور ننگے سر ہم اپنے پکڑنے والے کے پیچھے چل رہے تھے بھیڑوں کے گلّے کی طرح جنھیں ذبح کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہو۔ اس کے دوسرے ساتھی سورج کی روشنی میں چمکتی تلواریں ہاتھوں میں لیے ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

ہم ابھی آدھا میل چلے ہوں گے مگر ہمارے پاؤں پر تپتی ہوئی سڑک پر چلنے سے چھالے پڑ گئے تھے۔ ہمارے گرفتار کنندہ ایک چھوٹی سی مسجد کے نزدیک املی کے درخت کے نیچے رُک گئے اور ہمیں بھی تھوڑا آرام کرنے کے لیے کہا۔ ہم نے کہا کہ

114
www.taemeernews.com



ہمیں پیاس لگی ہے۔ پیتل کے برتن میں پانی ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ کچھ متجسس لوگوں کی بھیڑ ہمارے گرد اکٹھا ہو گئی تھی۔

"یہ فرنگی خواتین ہیں جو لالا کے مکان میں چھپی ہوئی تھیں۔ دیکھو تو کتنی خوف زدہ لگ رہی ہیں۔ ایک تو جوان ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں۔ دیکھو بالکل ماں کی آنکھوں کی طرح!"

اس گروہ میں ایک پیر بھی تھا جس نے ہمارے پکڑنے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا : "جاوید تم ان بد قسمت عورتوں کو اپنی عیاشی کے لیے پکڑ کر لائے ہو۔ وعدہ کرو کہ تم ان عورتوں کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کرو گے اور نہ ہی ان کا قتل کرو گے۔"

"اچھا تو یہ جاوید خان ہے۔" امّی نے آہستہ سے کہا۔

جاوید خان جس کا منہ ابھی تک ڈھکا ہوا تھا تلوار کو اپنے منہ کے سامنے لا کر بولا : "میں اس تلوار کی قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کو ماروں گا نہیں اور نہ ہی ان کے ساتھ کسی قسم کا بُرا سلوک کروں گا۔"

"اپنے ضمیر پر پکے رہنا جاوید" پیر نے پھر کہا : "تم نے قسم اٹھائی ہے اور پٹھان جب تک زندہ ہے اپنے قول پر پکا رہتا ہے۔ دیکھو ان دونوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ تمھاری اپنی زندگی مختصر ہو جائے۔"

"اس بات سے آپ بے فکر رہیں۔" جاوید نے کہا اور ہمیں اٹھنے کا اشارہ کیا۔

ہم پھر اس کے پیچھے چلنے لگے۔ لوگوں کی بھیڑ وہیں کھڑی رہی۔ ہم جلال نگر کی تنگ گلیوں میں سے گزر رہے تھے جہاں زیادہ تر آبادی پٹھانوں کی تھی۔

کئی گلیاں پار کر کے ہم ایک چھوٹے چوراہے پر آ گئے جس کے ایک کونے پر ایک گھوڑا بندھا تھا۔ جاوید خان نے گھوڑے کے پٹھے پر تھپکی دی۔ اپنے گھر کا دروازہ کھولا اور ہمیں اندر جانے کے لیے کہا، پھر وہ خود بھی ہمارے پیچھے اندر آ گیا۔ صحن میں ایک جوان عورت جھولے پر بیٹھی تھی، وہ ہمیں دیکھ کر ایک دم حیران ہو گئی۔

115
www.taemeernews.com



"یہ فرنگی خواتین ہیں۔" جاوید نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور بے تکلفی سے صحن پار کر گیا۔

ایک بوڑھی عورت امّی کے پاس آئی۔ "ڈرو مت بی بی۔ یہاں بیٹھ کر تھوڑا آرام کرلو۔" اس نے کہا۔

## جاوید خان

ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلنے کے بعد جاوید اپنے زنان خانے میں آیا تو اپنی بیوی سے کہنے لگا: "کیا کہتی ہو ان فرنگنوں کے بارے میں؟ میں نے کہا تھا نا کہ، جب تک میں ان کو ڈھونڈ نہ نکالوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا؟ اور کوئی معمولی آدمی ہوتا تو بہت پہلے ہی ان کی تلاش چھوڑ دیتا۔" بغلیں بجاتا ہوا وہ ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ ناشتہ اس کے سامنے ایک لکڑی کے پھٹے پر رکھ دیا گیا۔

اس کی بوڑھی چاچی جس نے ہمیں خوش آمدید کہا تھا اور جو کوٹھی والی کے نام سے جانی جاتی تھی امّی سے مخاطب ہوئی۔

"بی بی۔ اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ کون لوگ ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"ہم جو ہیں وہ تم دیکھ رہی ہو۔" امّی نے کہا۔ "اب ہم دوسروں کے محتاج ہیں۔ تمھارے اس رشتہ دار کے رحم و کرم پر ہیں۔ جب اس کے جی میں آئے وہ ہمیں قتل کر سکتا ہے۔"

"کون لینا چاہتا ہے تمھاری جان؟" جاوید خان بیچ میں بول اٹھا۔

"جب تک میں یہاں ہوں تم محفوظ ہو۔" کوٹھی والی نے کہا۔ "تم مجھ سے بے دھڑک ہو کر سب کچھ بتا سکتی ہو۔ تمھارا اور تمھارے ساتھ اس لڑکی کا کیا نام ہے؟"

"یہ خورشید ہے۔ میری اکلوتی بیٹی۔ میرا نام مریم ہے اور رامپور کے مشہور خاندان سے ہوں جہاں میرا باپ نواب کا وزیر تھا۔"

116
www.taemeernews.com



"کون سا رامپور؟" جاوید کی بیوی خان بیگم نے پوچھا۔

"روہیلوں کا رامپور!" امّی نے کہا۔

"اچھا وہ والا رامپور!" امّی کے شجرۂ نسب سے متاثر ہو کر خان بیگم نے کہا۔

"یہ میری بچّی ایک انگریز کے نطفے سے ہے۔" امّی نے میری طرف ایک پیار بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "جس دن بغاوت ہوئی اس کا باپ گرجا گھر میں قتل کر دیا گیا تھا۔ میں بیوہ ہو گئی اور یہ بچّی بن باپ کی۔ لالا رام جی لال نے ہم پر مہربانی کی اور ہماری جانیں بچالیں۔ ہم اس کے مکان میں رہ رہے تھے جب تمھارا یہ رشتہ دار ہمیں زبردستی وہاں سے نکال لایا۔ میری ماں اور گھر کے باقی لوگ ابھی بھی وہیں پر ہی ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے اب ہمارا کیا ہوگا۔ ہمارا اس دنیا میں اب کوئی سہارا نہیں۔"

امّی جذباتی ہو کر رونے لگی۔ میرا بھی دل بھر آیا اور میں امّی کی اوڑھنی میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

کوٹھی والی کو ہم پر ترس آگیا۔ میرے سر پر شفقت اور ہمدردی بھرا ہاتھ رکھ کر بولی۔ "مت رو۔ میری بچّی مت رو۔"

امّی نے اپنے آنسو پونچھے اور بڑھیا کی طرف دیکھا۔ "ہم بڑی مصیبت میں ہیں پھپھانی۔" وہ بولیں۔ "ہماری زندگیاں بخش دو اور ہمیں بے حرمت ہونے سے بچاؤ۔ میری تم سے یہی التجا ہے۔"

جاوید خان جو ہمارے رونے دھونے سے پریشان ہو گیا تھا کہنے لگا۔ "اے نیک خاتون تم فکر مت کرو۔ کوئی تمھیں قتل نہیں کرے گا۔ میں تمھیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں، بلکہ میں نے دوسروں کے ہاتھوں تمھاری بیٹی کو بے حرمت ہونے سے بچالیا ہے۔ جب تم چاہو میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

جاوید خان کی بیوی کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی۔ جاوید نے اس کی طرف غصّے بھری نظر سے دیکھا۔ "بے وقوف مت بنو، قابل!" وہ بولا۔

امّی کے کچھ کہنے سے پہلے کوٹھی والی بولی "تمھیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا جاوید۔ یہ دونوں اچھے گھر سے ہیں اور پریشان بھی ہیں۔ دیکھو تو کتنی گھبرائی ہوئی اور

117
www.taemeernews.com



پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ ان سے ہمدردی سے پیش آؤ اور ان کی اس حالت میں توہین مت کرو۔ میرا تم سے یہ کہنا ہے۔"

"یقین رکھو چاچی۔" اس نے کہا "مجھے ان سے پوری ہمدردی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اپنی شان و شوکت کھو بیٹھی ہیں۔"

"میں یہ جاننا چاہتی ہوں تم ان سے ملے کیسے؟" کوٹھی والی نے پوچھا۔ "دوسری عورتوں کی طرح تمھاری بیوی خان بیگم کیا اچھی عورت نہیں ہے؟ دیکھو تو کیسی تیکھی ناک ہے اس کی!"

"میں کب کچھ کہہ رہا ہوں؟" لیکن چاچی وہ بولا "میں کیسے بتاؤں چاچی کہ اس لڑکی نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا جب میں نے اس کے باپ کے گھر میں اسے دیکھا تھا۔ پہلی بار اس کو دیکھتے ہی اس کی خوبصورتی کا قائل ہو گیا تھا۔ وہ صبح کے تارے زہرہ کی طرح لگی تھی مجھے اور اب جب میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کہاوت سچ ہی لگتی ہے کہ پھول اپنی ٹہنی پر ہی خوبصورت لگتا ہے اور ٹوٹتے ہی مرجھا جاتا ہے۔ یقین مانو یہ اب بھی وہی فرشتہ صورت لگتی ہے جیسا میں نے اسے ایک مہینہ پہلے دیکھا تھا۔"

"تم نے اس کو اس کے باپ سے جدا کر کے بڑی بھول کی جاوید۔ کلی کو پھول بننے سے پہلے ہی تم نے توڑ دیا۔" خان بیگم نے کہا۔

"کیا بک رہی ہو تم قابل۔" جاوید تیز سے بولا۔ "خبردار اگر دوبارہ یہ بات دہرائی! میرے اندر کا شیطان ابھی سویا پڑا ہے اور اتنی سی بات پر جاگ پڑے گا۔"

اس نے میری طرف درد بھری نگاہ ڈالی اور میں اس کے چہرے سے اپنی نظر ہٹا نہ سکی۔ میری حالت اس زخمی پرندے کی سی تھی، چکی ناگ جس کی نظروں کو افسوں زدہ کر دیتا ہے۔ امّی اس کو اس طرح گھور رہی تھیں کہ اس کی بدکار روح کو کچل کر رکھ دیں گی اور وہ امّی کی درشت نگاہوں کے سامنے کھڑا رہا۔

"مجھے کوئی معمولی قاتل خیال مت کرنا۔" نادمانہ طور پر اس نے کہا۔ "میں نے صرف کافروں کا، اپنے لوگوں کے دشمنوں کا قتل کیا ہے۔ اس کے لیے میں کسی قصور کا نہیں بلکہ شاباش کا مستحق ہوں۔"

118
www.taemeernews.com



''زیادہ جوش میں مت آؤ۔'' کوٹھی والی پھر مخل ہوئی۔ ''میں تو تمھیں یہ بتانا چاہتی تھی کہ اگر تم خوبصورتی کے اتنے ہی پجاری ہو تو تمھاری خان بیگم نہ تو بدصورت ہے اور نہ ہی کالی۔ میں تو سمجھی تھی کہ فرنگی عورتوں کی آنکھیں نیلی اور بال نرم ہوتے ہیں مگر یہ بیچاریاں تو دیکھو کتنی خوف زدہ ہیں اور بالکل ہماری جیسی لگ رہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔'' جاوید ذرا سخت لہجے میں بڑبڑایا۔ ''قابل کی خوبصورتی کی اتنی بڑھ چڑھ کر تعریف نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے وہ کتنی حسین ہے۔ چھوڑو اس بات کو لیکن چاچی۔'' وہ میری طرف نرم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ''کاش تم نے اس لڑکی کو اس وقت دیکھا ہوتا جب میری نظر پہلی بار اس پر پڑی تھی۔ یہ گلاب کا پھول تھی جسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا ہلا سکتا تھا۔ یہ ایک معصوم ہرنی کی طرح تھی۔۔۔''

''تم اپنی بکواس بند نہیں کرو گے؟'' کوٹھی والی مخل ہوئی۔ ''اس کی طرف دیکھو اور بتاؤ کیا وہ ایسی لگتی ہے جیسی تم کہہ رہے ہو۔''

''واللہ! کچھ تبدیلی آگئی ہے اس میں۔'' جاوید نے حیران ہو کر جواب دیا اور پھر شاعرانہ انداز اختیار کیا۔ ''وہ اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ایک ہی مہینے میں وہ اپنی عمر سے بیس سال بڑی لگنے لگی ہے۔ لالا کے گھر میں جب میں نے اس کا بازو پکڑا تھا تو وہ بے ہوش ہونے کو تھی لیکن اس کی ماں کی آنکھوں میں جو وحشت طاری تھی اُس کا بیان نہیں کر سکتا۔ وہ غصّے میں اس شیرنی کی طرح سے تھی جس کے جسم کا ایک حصّہ کانٹے دار تیر سے زخمی ہو گیا ہو۔ اس نے اپنی چھاتیاں میری تلوار کی نوک پر رکھ دی تھیں۔ لڑکی کے پاس سے مجھے ہٹاتے ہوئے اس نے جو آنکھیں مجھ پر گاڑی تھیں، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں واقعی ڈر گیا تھا۔ کمزور پڑ گیا تھا۔ میری مردانگی ختم ہو گئی تھی۔ تلوار میرے ہاتھ سے گرنے کو تھی۔ اس کی رگوں میں یقیناً کسی جانباز کا خون ہے۔ یہ کوئی معمولی عورت نہیں۔'' اور امّی پر ایک مہربانی کی نظر ڈالتے ہوئے وہ بولا ''تم پر ہزار مہربانیاں قربان اے عورت!''

119
www.taemeernews.com



# پٹھانوں کے یہاں مہمانداری

"میرا خیال ہے تم اور میں ایک اچھے دوست بن سکتے ہیں۔" کوٹھی والی نے امّی سے کہا "تمھاری لڑکی تو مجھے بہت اچھی لگی ہے۔ آؤ بیٹی، میرے پاس آؤ۔" میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔

جاوید خان کھانا کھا کر باہر صحن میں چلا گیا تھا۔ اس کی بیوی اور چچی کو ہمارے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ ہم اگرچہ بھوکے اور پیاسے تھے، لیکن ہمارا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، کیونکہ نانی اور میری بہن آنیٹ کی ہمیں کچھ خبر نہیں ملی تھی۔ پھر بھی ہم نے اپنی طاقت کو بنائے رکھنے کے لیے تھوڑا بہت کھایا۔ جاوید خان دوبارہ اندر آیا تو یہ جان کر خوش ہوا کہ ہم نے اس گھر کا کھانا کھایا ہے۔

"تم میرے گھر کا نمک کھا چکی ہو اس لیے اب تم ہمارے لیے اجنبی نہیں ہو۔ اب تم اسی گھر میں بس جاؤ۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ لیکن میرے ساتھ دوسرے لوگ بھی تو ہیں۔ میری ماں ہے، بھانجی ہے۔ ان کے بغیر ایک لقمہ بھی منہ میں ڈالنا زہر لگتا ہے۔" امّی نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں وہ بھی آجائیں گے۔" جاوید بولا۔ "تمھاری بیٹی کو تو میں نے فساد شروع ہونے سے بہت پہلے دیکھا تھا اور میں اس پر مر مٹا تھا۔ ایک بدمعاش اسے اغوا کر کے لے جانا چاہتا تھا۔ اگر مجھے پہلے سے اس کا علم نہ ہوتا تو وہ اسے اٹھا کر لے بھی جاتا۔ میں تم لوگوں کو یہاں بری نیت سے لے کر نہیں آیا ہوں۔ تم جب بھی رضامند ہو میں خورشید سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ میں اسے بیوی کا رتبہ دوں گا۔"

"لیکن تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟" امّی نے پوچھا۔ "تم تو پہلے ہی سے شادی شدہ ہو۔"

"ایک سے زیادہ بیوی رکھنے میں کون سی رکاوٹ ہے؟ ہمارا قانون اس کی

120
www.taemeernews.com



اجازت دیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر تم مسلم ہو اور ایک مسلمان کی عیسائی لڑکی سے شادی کیسے ممکن ہے؟" امّی نے کہا۔

"ایسی کوئی وجہ نہیں کہ میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔" جاوید نے جواباً کہا۔ "پٹھان لوگ کسی بھی قوم کسی بھی نسل کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں ___ اور ___" اس کی بیوی نے تُنک مزاجی سے 'اوہ!' کہا اور وہ ذرا رُک کر پھر بولا ___ "میری بیوی کی کیا ہمت ہے کہ وہ میرے اس معاملے میں دخل دے۔ میرے باپ نے بھی تو ایک نیچ ذات کی خوبصورت آنکھوں والی عورت سے شادی کی تھی اور یہ چھوکرا سیف اللہ اسی کے بطن سے ہے۔ خدا کی مار اس پر۔۔۔! اور یہ کوٹھی والی نیچ ذات کی ایک ہندو عورت تھی جس کی نزاکت نے میرے چچا کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ میں اگر ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر لوں تو اس میں کیا حرج ہے؟"

اس کا منہ توڑنے کے لیے امّی کے ترکش میں بہت تیر تھے لیکن یہ دلیلیں پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ بات کو ابھی ٹالنے میں ہی مصلحت تھی۔

"مجھے یقین ہے تمھیں اپنی بات کا جواب اتنی جلدی نہیں چاہیے۔" امّی نے کہا۔ "میرا خاوند اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب مجھے صلاح مشورہ دینے والا کوئی نہیں۔ کیوں نہ اس بات کو کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیں۔"

"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں۔" جاوید نے فوراً جواب دیا۔ "اتنی اہم بات کا فیصلہ ایک ہی دن میں تو نہیں ہو جائے گا۔ اے نیک خاتون میں تمھیں ہفتہ بھر کا وقت دیتا ہوں۔ مگر ایک بات مت بھولنا کہ میرا یہ پیام اچانک ہی میرے دل میں نہیں آیا۔ یہ لڑکی کئی مہینوں سے میری نگاہ میں تھی اور اب اگر یہ موقع میں ہاتھ سے جانے دوں تو میرا نام جاوید نہیں۔ تم ضرور ٹھنڈے دماغ سے سوچ وچار کر لو۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔"

وہ پھر باہر صحن میں چلا گیا۔

اس صبح جو کچھ بھی ہوا اور اس پر جاوید کے شادی کے پیام کو لے کر میں سارا

121
www.taemeernews.com



دن سوچ میں پڑی رہی۔ ہمارا بستر برآمدے میں بچھایا گیا تھا۔ میں سیدھی لیٹی ہوئی چھت پر دو چھپکلیوں کو مکھیوں پر جھپٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ امّی کوٹھی والی کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی شائستہ اردو، نفاست اور اونچے اخلاق نے دم بھر میں کوٹھی والی کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ امّی کی باتوں نے اسے مسخر کرلیا تھا اور وہ ہمارے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کرنے لگی تھی۔ جاوید کے گھر وہ تھوڑی دیر کے لیے آئی تھی مگر اب جانا نہیں چاہتی تھی۔

"مریم کو میرے ساتھ بھیج دو۔ چند دن میرے پاس بھی رہ لے گی۔" اس نے اپنی بھتیجی سے کہا۔

"اور اس لڑکی کا کیا ہوگا؟" خان بیگم نے پوچھا۔ "کیا اسے یہاں اکیلا چھوڑ جاؤ گی؟"

"قطعی نہیں۔ وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ ہی آئے گی اور ہاں، قابل تم اس کی باتوں سے بالکل پریشان مت ہونا جاوید آج کل کچھ بدحواس سا ہو رہا ہے۔ جلدی ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ جہاں تک ان معصوم عورتوں کا سوال ہے، ان کا کوئی قصور نہیں۔ تم میرے ساتھ چلو گی نا مریم۔ کیوں؟"

"ہم تیار ہیں اگر ہمیں یہاں سے جانے دیا جائے تو۔" امّی نے کہا۔

ہم نانی اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے لیے فکر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ صدر دروازے پر ہو رہی بحث کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ یہ آواز ہمارے دوست اور محافظ رام جی لال کی تھی جس نے ہمیں ڈھونڈ نکالا تھا اور ہم سے ملنے کے لیے مُصر تھا۔

"خان صاحب" وہ جاوید سے کہہ رہا تھا۔ "یہ تمھاری زیادتی تھی کہ تم میری غیر حاضری میں میرے گھر میں گھس کر میری اجازت کے بغیر میرے مہمانوں کو لے آئے۔ اگر میں موجود ہوتا تو یہ حرکت کرنے کے لیے تمھیں میری لاش پر سے گزرنا پڑتا۔"

"اسی لیے تو میں تمھاری غیر حاضری میں گیا تھا کیونکہ میں تمھاری جان

122
www.taemeernews.com



نہیں لینا چاہتا تھا۔" جاوید نے کہا۔

"میں اگر ان کی حفاظت نہ کرتا تو ماتھر نہ کہلاتا۔ خیر اب جو ہوا سو ہوا میں تمھیں ان لوگوں کو واپس اپنے گھر پہنچانے کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے ذرا یہ پتہ تو لگانے دو کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ میں ان کو الوداع بھی کہنا چاہوں گا۔"

امّی دروازے پر گئیں اور خطرہ مول لے کر ہم سے ملنے آنے کے لیے لالا کا شکریہ ادا کیا۔

"بھگوان وشنو کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔" لالا نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ "ہماری کیا طاقت تھی کہ ہم اس ہونی کو روک سکیں۔ لیکن اطمینان رکھو اچھے دن بھی آئیں گے۔ میں تمھارے زیورات کا بکسہ تمھیں واپس دینے آیا ہوں۔"

امّی نے بکسہ ہاتھ میں لیا اور کھول کر اسے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انھیں یقین تھا کہ اس میں کوئی بھی چیز غائب نہیں ہوئی ہوگی۔

"وہ سونا جو تم نے مجھے دیا میں نے بیچ دیا تھا۔" لالا نے کہا۔ "30 روپے ملے تھے اس کے، وہ یہ رہے۔ ننھی اور نانی کو میں شام کے وقت چھوڑ جاؤں گا۔ باقی لوگ کچھ دیر اور میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہیں۔"

"ارے لالا! ہم تمھاری ان مہربانیوں کا قرض بھلا کیونکر اتاریں گے۔" امّی نے کہا۔ "انھیں تم اپنے پاس ہی رکھو یا جیسے تم ٹھیک سمجھو ویسے ہی کرو۔ لالا ہمیں تو اپنی دیکھ بھال بھی بھاری پڑ رہی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں انھیں اپنے ساتھ بریلی لیے جاتا ہوں اور تمھارے لیے حفاظت سے رکھ چھوڑوں گا۔"

اس نے جھک کر امّی کو سلام کیا اور چلا گیا۔ اس کے بعد ہم اس سے نہیں ملے۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ لالا اپنے بچّوں سمیت بریلی چلا گیا تھا اور ہماری پرانی نوکرانی دھانی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ ہمارے پالتو کتّوں کا کیا ہوا، اس کی ہمیں کچھ خبر

123
www.taemeernews.com



نہیں۔اسی شام جاوید خود لالا کے گھر جا کر نانی اور آنیٹ کو لے آیا، جو ہم سے مل کر بے حد خوش ہوئیں۔ مہمان نوازی کے اصول کے مطابق کھانا فوراً ان کے لیے پروسا گیا۔

آٹھ لوگوں کا ہمارا کنبہ سمٹ کر صرف چار افراد کا رہ گیا تھا۔ پلو، اس کی ماں اور چمپا لالا کے گھر پر رہ گئے تھے اور بہت عرصے تک ہمیں ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ جاوید اپنے گھر میں چودہ برس کے فرنگی لڑکے کو نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ پلو کے لیے بھی یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ وہ نہیں آیا، نہیں تو جاوید کے محلے میں جو سفاک لوگ رہتے تھے ان کے ہاتھوں مارا جاتا

## پلّو کا حشر

سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ میں گھر کے اُن تین لوگوں، جو لالا کے یہاں رہ گئے تھے، کے بارے میں کچھ قلم بند کروں۔

جیسے ہی لالا اور جاوید خان نانی اور آنیٹ کو لے کر گھر سے نکلے پٹھانوں کا ایک اور گروہ جن کا سردار منگل خان تھا وہاں پہنچ گیا۔ وہ زبردستی ان کے مکان میں گھس گیا۔ لالا کے گھر کی عورتیں پہلے کی طرح چھت پر چلی گئیں۔ پلو، اس کی ماں اور ان کی نوکرانی چمپا نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

''کہاں ہے وہ فرنگی لڑکا؟'' منگل خان نے چلا کر کہا۔ ''باہر نکالو اسے تاکہ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے جو اس جیسے دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا ہے۔''

یہ دیکھتے ہوئے کہ پلو کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں اس کی ماں منگل خان کے پاؤں پر گر پڑی اور اپنے لڑکے کی زندگی کے لیے بھیک مانگنے لگی۔

''تمھارا لڑکا!'' منگل نے سر سے پاؤں تک اس کی طرف دیکھا کیونکہ وہ بذاتِ خود کالی تھی، غیر یقینی طور پر اس نے کہا ''ہم دیکھیں گے وہ کیسا لگتا ہے؟''

پلو کا نستھوں کے لڑکے کی طرح بڑھیا پینٹ اور قمیض پہنے ہوئے باہر آیا۔

124
www.taemeernews.com



پاؤں میں نہ تو اس نے جرابیں پہنی تھیں نہ ہی جوتے اور نہ ہی سر پر کوئی ٹوپی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید تھا جسے وہ چھپا نہیں سکتا تھا۔

"یہ لڑکا تو میرے کندھوں تک بھی نہیں آتا۔" منگل نے اس کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ "کیا عمر ہے تمھاری؟" منگل نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

پلّو خوف کے مارے سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا وہ کیا جواب دیتا۔ وہ اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور بولی "تمھارا یہ غلام چودہ سال سے زیادہ کا نہیں ہے خان صاحب! اللہ کی خاطر اس کی زندگی بخش دو۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور وہ ایک بار پھر اس کے پاؤں پر گر پڑی۔

اُس کے بار بار گڑگڑانے سے پٹھان کے جذبات کو ٹھیس لگی اور رحمدلی سے بولا۔ "اُٹھ اے عورت، میری سمجھ میں آگیا ہے کہ لڑکا ابھی چھوٹا ہے اور کوئی نقصان پہنچانے کے لائق نہیں۔ کیا تم دونوں میرے ساتھ چلو گے؟ یاد رکھو اگر تم نے نہ کی تو اور لوگ بھی ہیں جو اتنے نرم دل نہیں جتنا میں ہوں۔"

لالا کا مکان چھپنے کے لیے اتنا محفوظ نہیں رہا تھا۔ پلّو کی ماں منگل خان کے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ وہ چمپا کو لے کر ایک دوسرے مکان میں آگئے جہاں پٹھان کثرت میں تھے اور منگل خان کے گھر میں پناہ گزیں ہو گئے۔

منگل خان دل کا بہت نرم اور سخی آدمی تھا، بھگوڑوں کو اپنے گھر لا کر وہ ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ پلّو کو اس نے غلام حسین کا نام دیا اور اس کی ماں غلام حسین کی ماں کے لقب سے پکاری جانے لگی۔ چمپا کا نام چمپا ہی تھا۔ وہ راجپوت گھرانے سے تھی اس لیے اس کی نسل کو متعین کرنے میں کوئی مغالطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ پلّو اور اس کی ماں منگل خان کی حفاظت میں رہنے لگے۔ آگے چل کر ان کے ساتھ کیا ہوا، اس کا لالا رام جی لال کا گھر چھوڑنے کے کئی ماہ بعد ہمیں پتہ چلا۔

125
www.taemeernews.com



# خطرے کی گھنٹیاں

یہ ہمارے فائدے کی بات تھی کہ ہم بھول جاتے کہ یورپی خون ہماری نسوں میں دوڑ رہا تھا یا پھر انگریزی حکومت دوبارہ قائم ہونے میں ہی ہماری بہتری تھی۔ ہماری بھلائی کے لیے یہ بھی ضروری لگا کہ ہم حضرت عیسیٰ کو بھول جائیں اور یہ یقین دلائیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ کوٹھی والی ہمیں کلمہ پڑھنا سکھاتی تھی لیکن امّی کہتی تھیں کہ وہ کلمہ پڑھنا جانتی ہیں اور یہ سچ بھی تھا مگر جب وہ دوسروں کے ساتھ نماز میں شامل ہونے کے لیے کہتیں تو امّی بہانہ کر دیتیں کہ ہم نماز کیونکر پڑھیں؟ ہمارے کپڑے گندے ہیں اور دوسرے کپڑے ہمارے پاس نہیں ہیں۔

ہمارے پاس فقط وہی کپڑے تھے جو ہمیں لالا رام جی لال کے گھر سے ملے تھے۔ جاوید کے یہاں آئے ہوئے ہمیں تیسرا دن تھا کہ اس بات پر اس نے پہلی بار دھیان دیا۔

''مریم!'' وہ بولا، ''میرے گھر میں یہ کپڑے نہیں چلیں گے۔ تم لوگ پاجامہ پہنا کرو۔''

''پاجامہ لانے کے لیے میں روپیہ کہاں سے لاؤں؟'' امّی نے کہا۔

اسی روز جاوید بازار سے کالی چھینٹ کا کپڑا لے کر آیا اور امّی کو دیا۔ امّی نے کپڑے کے پاجامے کرتے اور دوپٹے کاٹے اور میں نے اور آنیٹ نے ان پر سلائی کی۔ خان بیگم یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ امّی نے کتنی نفاست سے کپڑے کاٹے تھے اور آنیٹ اور میں سلائی کرنے میں کیسی مہارت رکھتی تھیں۔

نئے کپڑے زیب تن کرنے سے پہلے امّی چاہتی تھیں ہم لوگوں کے نہانے کا انتظام بھی کر دیا جائے۔ میرا خیال ہے ہمیں نہائے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا کیونکہ لالا کے گھر میں پانی کہیں نزدیک سے مہیا نہیں ہو سکتا تھا۔ لالا کے گھر کی عورتیں تو ہر صبح دریا میں جا کر نہا لیتی تھیں لیکن ہمارے لیے گھر سے باہر نکلنا خطرہ مول لینا تھا۔

126
www.taemeernews.com



جاوید خان کے گھر کے صحن کے بیچ ایک کنواں تھا، اس لیے ہمارے نہانے کے لیے ٹھنڈا پانی مہیا ہو سکتا تھا۔ امّی نے گھر کی نائن زیبان سے ہمارے نہانے کے لیے کنویں سے پانی کھینچنے کے لیے کہا اور یہ بھی کہ وہ نہانے میں ہماری مدد کرے۔ اس کے لیے اسے چار پیسے، یعنی ایک شخص کے لیے پانی کھینچنے کا ایک پیسہ اجرت دے گی۔ نائن اس اجرت کے ملنے کی امید سے بے حد خوش ہوئی۔ اُس نے صحن میں تین چار، چارپائیاں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر کھڑی کیں اور ان پر پردے کے لیے چادریں تان دیں۔ کوٹھی والی کو جب یہ پتہ چلا کہ ہم نہا کر نئے کپڑے پہننے والی ہیں تو وہ اس کو ایک تماشا سمجھ کر بڑبڑاتی ہوئی آئی۔ وہ ہمیں غسل کے مذہبی اصولوں سے واقف کرانا چاہتی تھیں۔

2 جولائی کا دن اصول صحت کے لحاظ سے ہماری زندگی کا بڑا یادگار دن تھا۔ کوٹھی والی خود اپنے ہاتھوں سے ہم پر پانی ڈالنا چاہتی تھی لیکن امّی نے سخت اعتراض کیا۔ امی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمارے گھر میں کسی کے سامنے چاہے وہ ہم جنس ہی کیوں نہ ہو، کپڑے اتارنے کا رواج نہیں۔ اس لیے کوٹھی والی کو زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔

کوٹھی والی ناامید ہو گئی۔ ”مگر تم یہ متبرک غسل کر کے پاکدامن کیسے بن سکو گی۔ کم سے کم تین لوٹے متبرک پانی کے تو ڈالنے ہی ہوتے ہیں؟“ اس نے کہا۔

جواب امّی کے پاس تیار تھا۔ انھوں نے کہا : ”ہم سب کو کلمہ حفظ ہے اور جب آخری تین لوٹے پانی کے ڈالنے رہ جائیں گے تو وہ اس بات کا خیال رکھیں گی۔“ یہ پریشانی تو دور ہوئی۔ ہم لوگوں نے کنوئیں کے تازہ پانی سے اپنے بدن صاف کیے۔ اس کے بعد نئے کپڑے زیب تن کیے جو ہم پر خوب جچے۔

ہم نے سکھانے کے لیے اپنے بال کھولے تو وہاں موجود عورتیں عش عش کر اٹھیں۔ ”ہائے! اتنے لمبے خوبصورت بال!“ اور میرے گھنگھرالے بال لمبے تو نہ تھے مگر چھلّے دار تھے۔ ان کو دیکھ کر وہ بولیں : ”یہ تو گھنگھر والے ہیں۔“ امّی اور نانی کے سر پر بھی اچھے گھنے بال تھے۔ نانی کے بال تو ایڑیوں تک پہنچتے تھے اور امّی کے گھٹنوں سے

127
www.taemeernews.com



تھوڑا نیچے تک۔ میری طرح آنیٹ کے بال بھی کمر تک ہی تھے لیکن تھے بڑے گھنے اور چوٹی گندھنے پر تو موٹی عورت کے بازو جتنی لگتی تھی۔ ہم بال سکھانے بیٹھیں تو عورتیں منہ کھولے ہمیں گھورتی رہیں۔ ہم نے ان کو بتایا کہ امّی جس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں وہاں کی عورتوں کے بال بہت لمبے اور گھنے ہوتے ہیں۔ اتنے سارے بالوں کو تیل لگانے کا بھی مسئلہ ہمارے سامنے تھا۔ خان بیگم نے ہم سے پوچھا۔ ''تم بالوں میں کون سا تیل لگاتی ہو؟'' امّی نے کہا کہ وہ ناریل کا تیل لگاتی ہیں۔ لیکن ناریل کا اتنا سارا تیل بھلا کہاں سے آئے گا۔ خان بیگم نے زیبان کو ایک پیسہ دے کر بازار سے میٹھا تیل لانے کو کہا۔ سینگ سے بنی بڑھیا دانتوں والی ایک کنگھی بھی منگوائی۔ نانی نے امّی کے بالوں کو تیل لگایا اور امّی نے میرے اور آنیٹ و نانی کے بالوں کو تیل لگایا۔

اگلی صبح ہم تر و تازہ اور خوش محسوس کر رہے تھے۔ ہم ایک اور سوٹ کے سینے میں مصروف ہو گئے۔ اسے ہم اگلے جمعہ کے دن پہننے کی سوچ رہے تھے، کیونکہ اکثر پٹھان عورتیں جمعہ کے دن ہی نہاتی تھیں۔

دس بجے کے قریب سرفراز خان جو جاوید کی بیوی کا چچا تھا جاوید سے ملنے کے لیے آیا۔ یہ شخص پولیس کے محکمے میں سپاہی تھا اور غدر شروع ہوتے ہی اپنے گھر واپس آ گیا تھا۔ وقت کے تقاضے کے مطابق وہ ایک تلوار، پستول، چاقو اور دو کالی بندوقوں سے لیس تھا۔ جاوید کو جب وہ دروازے پر ملا تو بڑے جوش میں تھا۔

''تم نے اپنے گھر میں کچھ فرنگی خواتین کو پناہ دی ہوئی ہے جاوید۔ کیا میں انھیں دیکھ سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم انھیں دیکھ سکتے ہو۔'' جاوید نے کہا۔ ''اور یقیناً خوبصورتی کے لیے میرے ذوق کی تعریف بھی ضرور کرو گے۔''

پستول پر ہاتھ رکھے اور ڈڑھیل چہرے کی خوفناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ برآمدے میں آ گیا۔ خان بیگم نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ ہم بھی سلام کے لیے جھک گئے۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بندوق کا کندہ زمین پر ٹکایا اور دوسرے ہاتھ سے نال کو پکڑ رکھا جو بیٹھنے کا خاصہ ہے۔

128
www.taemeernews.com



"تو یہ ہیں وہ فرنگی جنھوں نے سارے محلے میں ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔" وہ بولا۔ جاوید اندر مکان میں چلا گیا تھا۔ امّی نے اسے جواب دیا۔

"ہم بھلا کیا ہنگامہ کھڑا کر سکتی ہیں۔ ہم جو بے یار و مددگار ہیں۔"

"پھر بھی ہر ایک کی زبان پر یہ بات ہے کہ تم اس گھر میں اس لیے ٹکی ہو تاکہ تم اپنی بیٹی کے لیے خاوند تلاش کر سکو اور غالباً جاوید اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے! تم نے اس نیک عورت کو کیوں مصیبت میں ڈال دیا ہے۔" وہ خان بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

امّی اس کے الزام سے ناراض ہوئیں لیکن خود پر قابو رکھتے ہوئے حلیمی سے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھائی؟ تم شاید جانتے ہو گے کہ ہم اس گھر میں داخل بھی نہ ہوتیں اگر ہمیں یہاں آنے پر مجبور نہ کیا جاتا۔ جاوید خان ہمیں اپنی خوشی سے زبردستی اس گھر سے لے کر آیا ہے جہاں ہم کو ہر سہولت مہیا تھی۔ ہم اس کی مہربانیوں کے لیے شکر گزار ہیں۔ لیکن جہاں تک میری بیٹی کی شادی کا سوال ہے تو چاہے وہ جاوید سے ہو یا کسی اور سے، اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ میں تمھارے بھائی کی شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنی خواہش کو ہم پر تھوپا نہیں۔"

"پھر بھی سارا محلّہ یہی باتیں کر رہا ہے۔" سرفراز نے کہا۔ "یہی کہ جاوید تمھاری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس بات نے خان بیگم کو برہم کر دیا ہے۔"

"لوگوں کی زبان کو ہم کیسے روک سکتے ہیں؟" امّی نے کہا "ہم خان بیگم کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہونے دیں گے۔"

جاوید، جو ساری باتیں سن رہا تھا آگے بڑھا۔ وہ پریشان لگ رہا تھا۔ "بھائی جان! اس نیک خاتون سے سوال جواب کرنے میں اور ان لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنے میں جیسے کہ یہ لوگ گھس بیٹھیے ہیں، تمھارا کیا مقصد ہے۔ میں اپنے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ ان کو اس گھر میں لانے والا میں ہوں اور میں ہی ان کے لیے جواب دہ ہوں۔"

"لیکن تم نے اپنی نیک بیوی کو مصیبت میں کیوں ڈال دیا ہے؟" سرفراز نے

129
www.taemeernews.com



پوچھا "تم نے اپنی بے وقوفی سے ہمارے خاندان کا نام بدنام کر دیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں تمھیں یہاں کس نے بھیجا ہے۔" اپنے دونوں بازوؤں کو سینے لگا کر جاوید نے کہا۔

"ہاں عبدالرؤف نے مجھے یہاں بھیجا ہے یہ کہہ کر کہ ان عورتوں کو دریا کے کنارے لے جا کر ان کا سر قلم کر دیا جائے تاکہ تمھاری بیوی کے سینے میں جو آگ سلگ رہی ہے وہ بجھ جائے۔"

"کسی کو مجھ سے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ میں اپنے گھر میں کیا کروں کیا نہ کروں۔" جاوید نے سیدھا کھڑا ہو کر اور سر فراز کے قد سے اونچا اٹھ کر تلخ لہجے میں کہا۔ "عبدالرؤف اگر اتنا ہی عقلمند ہے تو پہلے اپنے گھر اور بیوی بچوں کا خیال کرے نہ کہ دوسرے کے گھروں میں تاک جھانک کرے۔ مجھے اس کی دخل اندازی قطعی پسند نہیں اور یہ قابل بڑی بے وقوف عورت ہے جو پڑوسیوں سے بڑھ چڑھ کر باتیں کرتی ہے۔ مجھے اس پر لگام لگانی ہو گی۔"

دونوں پٹھان آپس میں جھگڑ پڑے اور نہ جانے کیا کر بیٹھتے اگر امّی ان کے بیچ میں نہ آتیں "جہاں تک ہمارے سر قلم کرنے کا سوال ہے خان صاحب، تو تلوار تمھارے قبضہ میں ہے۔ ہم میں سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اللہ کی اگر یہی مرضی ہے کہ ہم تمھارے ہاتھوں مریں تو ایسا ہی سہی۔ لیکن میں تم سے ایک درخواست ضرور کروں گی کہ تم ہم سب کو بلا کسی رورعایت کے ایک ساتھ قتل کرو گے۔ میں تمھیں ایک یا دو کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دونگی۔"

امّی کے بلند حوصلے اور اللہ کا واسطہ دینے سے سر فراز نرم پڑ گیا۔ وہ اسی تپاک سے امّی کی طرف بڑھا جیسے دوسرے بڑھے تھے۔

"کتنا اعتماد ہے تم میں! کتنا حوصلہ ہے!" وہ بولا۔ "میں اس معاملے سے بری الذمہ ہوتا ہوں۔ مجھے دراصل گمراہ کر دیا گیا تھا۔ ایک عورت نے مجھے میرے غلط ارادوں سے بچا لیا!"

"یہی اللہ کی مرضی تھی!" جاوید نے کہا "تم دوبارہ یہ بے وقوفی نہیں

130
www.taemeernews.com



کروگے۔ ارے اپنے رشتہ داروں کی خاطر تم اپنے دل کو زہر آلود کیوں کرتے ہو؟ میں خوب جانتا تھا کہ یہ سب ان کی کرنی تھی۔"

## ایک اور پیش کش

سرفراز کو آئے ہوئے دو تین دن گزر چکے تھے۔ ہم ایک روز جب رات کا کھانا کھا چکے تو جاوید کمرے میں آکر آرام سے لکڑی کی پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

امّی کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "مریم تم نے مجھ سے اس موضوع پر جو مجھے بہت عزیز ہے، بات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب تک تم نے اس کے بارے میں سوچ وچار کر لیا ہوگا۔ مجھے اب کوئی معقول سا جواب چاہیے۔"

"کس موضوع کی بات کر رہے ہو تم؟" امّی نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مطلب تمھاری بیٹی سے شادی کی میری پیش کش سے ہے۔"

"میرے پاس اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔" امّی نے کہا۔ "مسئلہ اہم اور غور طلب ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ تمھارا سالا ہمیں قتل کرنے کے ارادہ سے آیا تھا۔ تمھاری حفاظت میں ہوتے ہوئے بھی اگر تلوار ہمارے سر پر لٹکتی رہے تو شادی جیسے مسئلے پر بات کرنا بے سود ہے۔ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میری بیٹی بھی کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ وہ مجھ سے جدا نہیں رہ سکتی، سرفراز جیسا کوئی دوسرا آدمی بھی تو کسی وقت آسکتا ہے۔"

"قسم میرے سر کی جب تم اس طرح کی باتیں کرتی ہو تو میرا غصہ بڑھ جاتا ہے۔" جاوید نے کہا۔ "اگر اس نے تم میں سے کسی کے اوپر ہاتھ اٹھایا ہوتا تو وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ جب تک تم جاوید کی چھت کے نیچے ہو کسی کی کیا مجال کہ وہ تم لوگوں کی طرف انگلی اٹھا سکے۔ اپنے فرنگی مہمانوں کی حفاظت کی خاطر میں آدھا درجن لوگوں کے سر قلم کر دوں گا۔" اس نے میری طرف غصے اور خون خوار نظروں سے اس طرح دیکھا کہ میں کانپ اٹھی اور امّی کے پیچھے ہو کر اپنا منہ چھپا لیا۔

131
www.taemeernews.com



وہ شدت کی حد تک برانگیختہ تھا اور اسے خاموش کرنے کے لیے امّی نے کہا:
''مجھے یقین ہے کہ تم ہماری حفاظت کرنے کی پوری طاقت رکھتے ہو۔ لیکن تم بار بار اس پیش کش کو کیوں دہراتے رہتے ہو؟''
''کیونکہ یہ میرے دماغ میں بری طرح گھسی ہوئی ہے۔ میں اس میں تاخیر نہیں چاہتا۔''
''اگر تم ہمارے حالات اور ہمارے خاندان کی تاریخ سے واقف ہوتے تو تم خود ہی سمجھ جاتے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی رچانے کے قابل نہیں ہوں۔'' امّی نے کہا۔
''لیکن کیوں؟'' جاوید نے پوچھا۔
''میرے بھائی ابھی زندہ ہیں۔ جب ان کو پتہ چلے گا کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی تم سے کردی ہے جبکہ وہ ابھی بچی ہے تو ان کو کیا جواب دوں گی؟ اس کے علاوہ میرے خاوند کا چھوٹا بھائی بھی ابھی زندہ ہے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے ان سے مشورہ لینا ہوگا۔''
''شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔'' جاوید نے کہا۔ ''لیکن تم سے وہ کچھ نہیں کہیں گے یہ ناممکن سی بات ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ بھی دوسرے فرنگیوں کے ساتھ مار دیے گئے ہوں۔''
''نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ عقلمندی کی بات تو یہ ہوگی کہ ہم کچھ دیر اور انتظار کریں اور کسی فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے اس بات کی تصدیق کرلیں کہ وہ واقعی مار دیے گئے ہیں۔''
''میں بڑا بے صبرا ہوں مریم اور زندگی اتنی لمبی نہیں کہ میں ابد تک اپنی خواہشوں کے پورا ہونے کا انتظار کروں۔ میں نے تمھارا اور تمھاری خواہشات کا احترام کرتے ہوئے خود کو روکے رکھا ہے۔ لیکن تمھاری بیٹی کو اپنی بیگم بنانے کی خواہش دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے اور میں اسے اپنانے کے لیے کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔''
''ذرا سوچو اگر انگریز سرکار پھر اقتدار میں آجاتی ہے، اس صورت میں ہمیں

132
www.taemeernews.com



کیا کرنا ہوگا؟ تمھاری زندگی بے معنی سی ہو جائے گی۔ تم ختم کر دیے جاؤ گے اور میری بیٹی تیرہ برس کی عمر میں بیوہ کہلائے گی۔ کیا تم کچھ مہینے انتظار نہیں کر سکتے؟ جب تک ہم لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ اس ملک پر کون حکومت کرے گا۔"

"اگر انگریزوں کا شاہ جہاں پور پر دوبارہ قبضہ ہو گیا تو وہ باغیوں کے سرداروں سے کوئی رحمدلی نہیں دکھائیں گے۔ یہاں کسی نزدیک درخت سے مجھے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ بلاشک تم ان کی واپسی کی امید باندھے ہوئے ہو ورنہ تم اس قسم کے امکان کی بات کیوں کرتیں۔ اب بھلا کتنے فرنگی باقی بچے ہوں گے؟ فقط چند ہزار جو دلّی کی فصیلوں سے جوجھتے ہوئے بمشکل خود کو بچا رہے ہوں گے اور انشاءاللہ ان کا بھی جلد صفایا کر دیا جائے گا۔"

"تو دلّی کو ہمارے مستقبل کا فیصلہ کر لینے دو۔" امّی نے ہاتھ میں ایک تنکا لیتے ہوئے کہا۔ "برطانیہ کی فوج جو اب دلّی کا محاصرہ کیے ہوئے ہے، ختم ہو جائے گی تو تمھاری پیش کش پر بات ہو سکتی ہے۔ کیا ابھی ہم تمھارے سہارے نہیں پڑے ہوئے اور تمھاری طاقت کے زیر اثر نہیں؟ تم ذرا جنگ کے خاتمے کا انتظار کرو۔"

"تم بہت لمبی ہانک رہی ہو مریم، اور شاید یہ بھول رہی ہو کہ میں تمھاری مرضی کے خلاف ہی نہیں بلکہ ہر کسی کی مرضی کے خلاف ـــــ" اس نے اپنی بیوی کو گستاخانہ نظر سے دیکھا ـــــ "وہ جو حاسد نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے تمھاری لڑکی سے شادی کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔"

"میں نے کب کہا کہ تم میں یہ جرأت نہیں ہے؟" امّی نے کہا۔ "اگر تم اسے زبردستی لے جاؤ گے تو ہم میں اتنی طاقت کہاں کہ ہم تمھیں روک سکیں۔ لیکن یہ فعل تمھارا مردانہ فعل نہیں ہوگا کہ تم بنا باپ کی بیٹی کو اپنی ہوس کا شکار بناؤ۔ اس میں کون سی بڑی بات ہو گی؟ لیکن اگر تم اس وقت تک انتظار کرو جب تک انگریزوں کو دلّی سے کھدیڑ نہیں دیا جاتا تو میری ساری دلیلیں بے کار ثابت ہو جائیں گی۔ تب تک میری بیٹی کی عمر بھی شادی کے لائق ہو جائے گی۔"

"تم بہت خوش قسمت ہو کہ میں ایک مرد ہوں لیکن تمھاری بیٹی کو جاوید

133
www.taemeernews.com



کے ہاتھوں سے کوئی نہیں چھین سکتا اور یہ جاوید کی بیوی بن کر رہے گی۔ میں اسے بہت سامال اسباب دوں گا۔ اور مریم اگر تم میری بات مانو تو تم بھی شادی کرلو اور پھر سے اپنا گھر بسالو۔ تم ابھی جوان ہو۔"

"میں بھلا کیوں اب شادی کرنے لگی؟"

"تمھیں شادی کرلینی چاہیے۔ اگر تمھیں دوبارہ اپنا گھر چاہیے اور کھانے کے لیے روٹی۔"

"میں کیوں شادی کرنے لگی!" امّی نے پوچھا۔ "میری ان بچیوں کا کیا ہوگا؟"

"تمھاری بچی تو میری بیوی بن جائے گی۔" جاوید نے خوش ہو کر کہا۔ "رہی تمھاری بھانجی تو اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ وہ بھی کوئی کم خوبصورت نہیں ہے۔ کیوں؟"

شام تک ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ جاوید خان حقہ لے کر بیٹھ گیا اور کش پہ کش کھینچنے لگا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس نے باقی لوگوں کے دماغ میں کیا کیا چل مچادی ہے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ خان بیگم اتر ہوا چہرہ لیے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور مجھے دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر لیتی تھی۔ امّی بھی مجھے اور آنیٹ کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر لیتیں اور میں ان کو پریشان کن نگاہوں سے دیکھ لیتی۔

جیسے ہی ہم اپنے گھر کے حصے میں جانے کے لیے اٹھے خان بیگم نے امّی کا ہاتھ پکڑلیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "مریم تم میری ماں ہو۔ تم اس کی اتنی مدد مت کرنا جس سے میری ذات کو اور زیادہ اذیت پہنچے۔ میں پہلے ہی بہت کچھ سہن کر چکی ہوں۔ وعدہ کرو کہ تم اپنی بیٹی کو اس کے ساتھ نہیں بیاہو گی۔"

امّی نے جواب دیا۔ "بی بی تم نے وہ سب دیکھا اور سنا ہے جو کچھ ہوا ہے۔ ان جیتے جاگتے لوگوں میں میری حالت تو ایک مردے جیسی ہے۔ تم خواہ مخواہ میں پریشان ہو رہی ہو۔ اگر میرے بس میں ہو تو وہ کبھی میری رضامندی حاصل نہیں کر سکے گا۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ میری رضامندی ملنے تک انتظار کرے گا؟"

"اللہ تمھارا بھلا کرے گا!" خان بیگم بولی "اس گھر میں کم حیثیت رہنے کی

134
www.taemeernews.com



نسبت تمھاری بیٹی اچھی زندگی کی مستحق ہے۔ میں تمھاری خواہشات کی تکمیل کے لیے دعا کروں گی۔"

اس رات میں اچھی طرح سے سو نہ سکی۔ پورے چاند کی روشنی سلاخوں والی اونچی کھڑکی میں سے بستر کی پائنتی پر پڑی رہی تھی لیکن سرسام پیدا کرنے والے پنچھی کی آواز مجھے سونے نہیں دے رہی تھی۔ ایک بار میری جو آنکھ کھلی تو سامنے جاوید خان کو دروازے پر کھڑا پایا۔ اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ وہیں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ خوف کے مارے میں نہ تو ہل سکتی تھی اور نہ ہی چلا سکتی تھی۔ پھر وہ مڑا اور وہاں سے چپکے سے چلا گیا۔ ڈر کے مارے کانپتے ہوئے میں نے اپنی بانہیں امّی کے گرد حائل کر دیں اور رات بھر ان کے ساتھ چپٹی پڑی رہی۔

## نمائش

خان بیگم جب پہلے اپنی نند کے ہاں گئی تھی تو اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ پھر اس سے ملنے آئے گی۔ جمعرات کے روز ایک نوکر اس کے پاس پیغام لے کر آیا۔ "تمھاری نند نے سلام بھیجا ہے اور پوچھا ہے کہ تم اس سے ملنے کا وعدہ کب پورا کرو گی۔"

"میری نند کو میرا سلام کہنا اور بتانا کہ میرا ابھی آنا مشکل ہے۔ ہمارے ہاں کچھ فرنگی خواتین رہنے کے لیے آئی ہوئی ہیں جن کو میرے خاوند نے پناہ دی ہے۔"

بعد میں ایک اور پیغام آیا کہ خان بیگم اپنے مہمانوں کو بھی اپنے ہمراہ لیتی آئے۔ اس کے رشتہ داران کے دیدار کے متلاشی ہیں۔ ہماری میزبان نے اگلی صبح ہم سے اس کے ساتھ اس کی نند کامران کے یہاں جانے کی پیش کش کی۔

ہم چاروں ایک میانے میں بیٹھیں۔ خان بیگم، امّی، آنیٹ اور میں۔ نانی پیچھے رہ گئیں۔

میانہ پرانے طرز کی ایک چھوٹی سی پالکی ہوتی ہے۔ زمین پر رکھنے کے لیے

135
www.taemeernews.com



اس کے ٹھنٹھ سے بنے چار پائے ہوتے ہیں۔ اس کے فرش پر ٹاٹ بچھا ہوتا ہے اور چھت لال پردے سے ڈھکی ہوتی ہے اور پردہ چاروں طرف لٹکا ہوتا ہے۔ بانس کے دو ڈنڈے دونوں طرف ٹھونسے جاتے ہیں جن کے ذریعے کہار اسے زمین سے اٹھاتے ہیں۔

پسینے سے تر چار کہار ہمیں کامران کے گھر لے آئے جہاں ہمیں تپاک سے خوش آمدید کہا گیا۔ پہلے تو کامران ہم سے بد ظن تھی لیکن سر فراز نے اسے پورے حالات سے آگاہ کر کے شبہ کو ختم کر دیا تھا۔ وہ ہم سے ملاقات کی بے حد مشتاق تھی اور ہمیں روکنے کے لیے اس نے بہت زور دیا۔ آنے والے دنوں میں ہم اس کے گھر میں سجاوٹ کی چیز بن گئے جن کو دیکھنے کے لیے لوگ آتے رہتے تھے۔

سر فراز جاوید کے گھر ہمیں قتل کرنے کی غرض سے آیا تھا لیکن امّی کی شخصیت نے اس پر وہ جادو کیا کہ وہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ گھر لوٹ کر اس نے کہا: "ایسے معصوم لوگوں پر بھلا کون ہاتھ اٹھا سکتا ہے؟ ماں تو ایک ڈری ہوئی کبوتری کی طرح ہے اور بیٹی ایک بلبل۔" کامران کے گھر پر ہمیں دیکھنے کے لیے سر فراز کی بیوی حشمت بھی آئی۔ وہ بھی امّی کی گرویدہ ہو گئی۔ "اور بہنا!" اس نے کامران بیگم سے کہا "میرے خاوند کی رائے ان لوگوں کے بارے میں بالکل صحیح تھی۔ مریم کے ہونٹوں سے شہد کی مکھی کی طرح فقط شہد ہی ٹپکتا ہے۔"

کامران کا ہمدردی بھرا نرم و نازک دل ہماری دکھ بھری کہانی سن کر بے حد متاثر ہوا۔ امّی کی باتیں سن کر اس کی بڑی بڑی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک بار تو وہ امّی کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

کامران پینتیس سال کی تھی۔ چربی اس پر چڑھتی جا رہی تھی، لیکن اس کے نقش و نگار تیکھے اور رنگ صاف تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ شادی کا جوڑا پہن کر بیٹھی ہوئی تھی تو اس کا باپ اس کے پاس سے گزرا۔ وہ اس کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوا کہ کہہ اٹھا۔ "کیا ہم ایسی خوبصورت لڑکی کو کسی اپنے کے لیے گھر میں محفوظ نہیں رکھ سکتے تاکہ وہ ہمارے خاندان سے باہر نہ جاتی!"

136
www.taemeernews.com



کامران کا خاوند جو عمر میں اس سے بڑا تھا، بھوپال میں فوجی رسالے میں لفٹیننٹ تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں اسے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسے اس کی حرکتیں پسند نہیں تھیں اور وہ اسے ہاتھ تک لگانے نہیں دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ماں اور دوسری عورتیں یہ سمجھنے لگیں کہ اس پر کسی جن بھوت کا سایہ ہے۔ وہ ان کا یہ بھرم بنائے رکھنے میں مصلحت سمجھتی تھی۔ اس کا خاوند پریشان تھا اور وہ اپنے رسالے میں واپس چلا گیا لیکن اپنی بیوی کی روپے پیسے سے مدد کرتا رہا۔ آخر کچھ دوستوں کی مہربانی سے دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ کامران کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام بدرن رکھا گیا۔

بدرن اپنی ماں سے بالکل مختلف تھی۔ ہم نے جب اسے دیکھا تو وہ سولہ یا سترہ برس کی تھی۔ ماں کی نسبت اس کا رنگ کالا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وہ تروتازگی نہیں تھی جو اس کی ماں کے چہرے پر تھی لیکن اس کے بائیں گال پر گلابی نشان اس کے چہرے کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرح زندہ دل بھی نہیں تھی اور نہ ہی زیادہ چھان بین کرتی تھی۔ ہماری اس سے بہت کم ملاقات ہوئی تھی۔

کامران ہماری سلائی کے بارے میں سن چکی تھی۔ وہ اپنی نند کے لڑکے کو ایک تحفہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے ہم سے اس کے لیے ایک چھوٹا پاجامہ، کوٹ اور ٹوپی بنانے میں ہماری مدد چاہی۔ امّی نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی کہ وہ کپڑا کاٹ کر اسے سی بھی دیں گی۔

اس نے جینگنی رنگ کے کپڑے کا کرتا کاٹا جس کا گلا مغلئی انداز کا تھا، یعنی اس کا دہانہ بائیں طرف تھا اور بٹن کندھے پر لگا تھا۔ کرتے کے کنارے پر، بازو اور گلے پر سنہری لیس لگائی۔ گلے پر قوس کی شکل کی سنہری کڑھائی کی۔ پٹی اور کندھے پر چمکیلے ستارے ٹانکے۔ پاجامہ بڑھیا بری ساٹن کا بنایا اور اس پر بھی سنہری لیس لگائی۔ ٹوپی کوٹ والے کپڑے کی بنائی اور اس پر سامنے کئی آویزے ٹانکے جو پہننے پر ماتھے پر ایک فیتہ سا لگتے تھے۔ یہ تینوں کپڑے کامران کو تقریباً چالیس روپے میں پڑے جو ایک بچہ

137
www.taemeernews.com



کے جوڑے کے لیے قدرے مہنگے تھے۔

امّی اپنے کام سے بے حد خوش تھیں اور جس کسی نے یہ جوڑا دیکھا جھوم اٹھا۔ کامران نے امّی کو نئی چوڑیوں کا تحفہ دیا جو شیشے کی تھیں اور ان پر مینا کاری کی ہوئی تھی۔

جلدی ہی ہم کامران کے گھر والوں کی منظور نظر بن گئیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہم پر مہربانی لٹانے کے لیے تیار تھا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھتی تھیں کہ ہم فرنگی ہونے کے ناطے اور یورپی عورتوں کی طرح دروازے اور کھڑکیوں کے پاس ہی بیٹھی رہیں گی تاکہ مرد لوگ ہمیں دیکھ سکیں۔ لیکن جب وہ ہمیں سوئی دھاگہ لیے محنت کرتے ہوئے دیکھتیں اور ہم مردوں کی محفل سے کتراتیں تو وہ بہت حیران ہوئیں۔

"تم تو ہماری جیسی ہی ہو۔" ایک دن کامران نے امّی سے کہا "میں اپنی نسل کی آدھی درجن عورتوں کے بدلے میں بھی تمھیں نہیں جانے دوں گی۔ تم سے بھلا کون تنگ آجائے گا؟"

زنان خانے میں سیاست کا کوئی دخل نہیں تھا۔ جنگیں اور بہادری کے کارنامے مردوں کے لیے ہی مخصوص تھے۔ شاید ہی کبھی ملک میں پھیلی افراتفری یا ہماری مصیبتوں کا ذکر چھڑا ہو۔ فقط ایک ہی بار ہماری آسودہ زندگی برہم ہوئی تھی اور وہ بھی عمدہ نامی ایک عورت کی وجہ سے جو شروع ہی سے ہم سے حسد کرتی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ کامران سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو آپا کہہ کر پکارتی تھیں اور بدرن ان کو خالا کہتی تھی۔ وہ ایک بدباطن جوان عورت تھی۔ منہ پھٹ اور تیز طرار اور غیر ملکیوں سے نفرت کرتی تھی۔ وہ ہمیں اس گھر میں دیکھ کر بڑی ناخوش تھی۔ ہمیشہ گھورتی رہتی تھی اور ہر موقع پر ہمارے بارے میں غلط بیانی کرتی تھی۔

انگریزوں کی ہار کا سن کر عمدہ بے حد خوش ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ انگریزی فوج دلّی کی فصیلوں سے پرے بھگا دی جائے گی۔ اکثر وہ عام باتوں کو چھوڑ کر لوگوں کی

138
www.taemeernews.com



ذاتیات کی طرف زیادہ توجہ دیتی تھی۔

ایک دفعہ آنیٹ اور میں بدرن کے لیے پاجامہ سی رہے تھے۔ بدرن برآمدے کے کونے میں بیٹھی اپنی خوش خلق خاوند حفیظ اللہ خان کے کانوں میں خرافات بھر رہی تھی جبکہ خان کی نظریں عمدہ پر تھیں۔

اُس نے بات کا رُخ بدل کر انگریزوں کے خلاف نفرت اگلنا شروع کی، یعنی انگریز عورتوں کی مردوں کو رجھانے کی عادت۔

"یہ بدکار عورتیں" اس نے کہا۔ "یہ مردوں کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔"

"ہاں چچی" برآمدے کے دوسرے کونے سے حفیظ اللہ خان نے کہا اور شاید یہی ان کے لیے صحیح فعل ہے۔ وہ مردوں میں اتنی گھری رہتی ہیں اسی لیے ان لوگوں کی ہوس تم لوگوں سے کم ہوتی ہے اور پھر سبھی مرد تمھارے خاوند کی طرح اینچی نہیں ہوتے جن کو گندگی میں لوٹنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہوتا۔"

"ہو سکتا ہے۔" وہ ترشی سے بولی۔ "لیکن تمھاری اس بات کا فرنگیوں سے کیا تعلق؟ اس بات سے تم انکار نہیں کر سکتے کہ یہ عورتیں اجنبی مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی، نیم برہنہ ہوتی اور کمر میں بانہیں ڈال کر ناچا کرتی ہیں اور ناچتے ہوئے وہ اندھیرے کونے میں چلی جاتی ہیں اور اپنے خاوند کو چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ بوس و کنار کرتی ہیں!"

فرنگی عورتوں کے ان طور طریقوں کے اظہار سے بدرن کی چمکدار آنکھیں حیرانی سے چوڑی ہو گئی تھیں۔

"مجھے تو اس کا علم نہیں چاچی۔" حفیظ اللہ نے کہا "تمھیں ان سب باتوں کا کہاں سے پتہ چلا چاچی؟"

"کہیں سے بھی۔" وہ بے چینی سے بولی۔ "لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے اور اسی لیے میں یہ کہتی ہوں کہ یہ فرنگی خواتین کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور کھڑی کریں گی۔"

"تم بے ہودہ بات کر رہی ہو چاچی" حفیظ اللہ نے کہا۔ "میں قسم کھا کر کہتا

139
www.taemeernews.com



ہوں تم بات کرتے وقت بالکل بے پروا ہو جاتی ہو۔ ہمارے مہمانوں کے خلاف تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"جب وہ پہلے پہل جاوید کے گھر میں آئیں تو اڑوس پڑوس کے مردوں میں کافی بل چل مچی تھی۔"

"ممکن ہے" حفیظ اللہ نے طنزاً کہا۔ "میرا خیال ہے تمھارا خاوند بھی تو بڑا جوش دکھا رہا تھا۔ پھر کیا ہوا؟"

"تم بڑے احمق ہو حفیظ اللہ" اس نے شرارت سے کہا اور ہم سب کے سامنے اس کو آنکھ مارتے ہوئے کہا "تمھارے اپنے ارادے کیا ہیں۔ بتاؤ؟"

"آج تم بہت واہیات باتیں کر رہی ہو چاچی۔" حفیظ اللہ نے ذرا بگڑ کر کہا۔ "تمھاری اس کھوپڑی میں در پردہ کون سی بات ہے، بتاؤ؟ میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ مریم اور اس کی بیٹی کے بارے میں جو کچھ کہو سوچ سمجھ کر کہنا!"

"یہ لڑکا تو ان سفید رنگ پوئیوں کا بڑا حمایتی نکلا! لیکن ان کو دیکھ کر مجھے بہت کوفت ہوتی ہے؟"

بحث کچھ تھم گئی تھی۔ امی، آنیٹ اور میں اس بات چیت کے دوران خاموش ہی رہے۔ ہم اپنے حق میں کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھے۔ ہم کامران کی مروت پر تھے اور ہمارا کسی سے جھگڑا کرنے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ ہم حفیظ اللہ کی حمایت میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

عمدہ شرارت پر تلی ہوئی تھی اور موضوع بدلنا نہیں چاہتی تھی۔

"میرا بیٹا بھی مہم میں شامل ہو گیا ہے۔ میں ڈرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ وہ کوئی فرنگی عورت گھر پر نہ لے آئے۔"

حفیظ اللہ جواب دینے کے لیے تیار تھا۔ "بلاشک تمھارا بیٹا اس مہم میں بہادری کے بڑے کارنامے دکھائے گا۔ لیکن چونکہ اسے چند باغی زمینداروں کو کچلنے کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے میرے خیال میں کوئی فرنگن اس کے ہاتھ نہیں لگنے والی۔"

اس سے پہلے کہ عمدہ کچھ کہتی حفیظ اللہ کھڑا ہو گیا اور اسے اپنے گھر جانے

140
www.taemeernews.com



کے لیے کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سامنے ہمیں کوئی برا بھلا کہے۔ لیکن عمدہ اپنی بات کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

"دعا میں بہت طاقت ہوتی ہے" اس نے کہا "میں نے خان بیگم سے کہا ہے کہ ہاتھ میں راکھ لے کر ان عورتوں کی طرف اڑا دے تاکہ یہ لوگ راکھ کی طرح اڑ جائیں۔" اس نے چٹکی بھر مٹی ہماری طرف پھینکی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی۔

حفیظ اللہ سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ اس نے عمدہ کو پکڑ کر برآمدے سے باہر کر دیا اور چلے جانے کو کہا نہیں تو وہ بری طرح سے اس سے پیش آئے گا۔ لوٹ کر وہ اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے غصہ ٹپک رہا تھا۔

## برسات

کامران گھر لوٹی اور اسے عمدہ اور اس کے داماد کے بیچ ہونے والے جھگڑے کا پتہ چلا تو کہنے لگی۔ "میرے لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ عمدہ کی زبان تو بہت لمبی اور زہریلی ہے۔ تم لوگ میری مہمان ہو تو اس کی چھاتی پر کیوں سانپ لوٹتا ہے؟ اسے تمھارے صبر و تحمل سے کچھ سیکھنا چاہیے تھا۔" پھر حفیظ اللہ سے بولی "تمھیں اسے گھر سے باہر نہیں نکالنا تھا۔ لیکن تم نے ان مصیبت زدہ عورتوں کا ساتھ دے کر ٹھیک کام کیا۔ مریم اس نامعقول کو تم معاف کر دو۔ وہ ایسا نہ کرتی تو یہ نوجوان اس پر کیوں برستا۔ میرا گھر تمھارے لیے ہمیشہ کھلا ہے۔"

برسات اپنے جوبن پر تھی۔ گھنے بادل مغربی آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کا جھونکا برسات کی آمد کی خوشبو بکھیر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحن میں آگے یاسمین کے پودوں پر ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔

شمالی ہندوستان میں عورتوں کے لیے یہ تیوہار کا دن تھا۔ رنگ برنگی پوشاکیں پہن کر عورتیں جھولا جھول کر اپنی خوشی اور لاابالی پن کا اظہار کرتی ہیں۔ درختوں پر دو رسیاں ڈال کر ان پر خوبصورت رنگوں میں رنگے ہوئے لکڑی کے تختے لگاتی ہیں۔ دو

141
www.taemeernews.com



عورتیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ رسّی کو پکڑ لیتی ہیں اور پاؤں نیچے نکالیتی ہیں۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ جھولتی ہیں، پھر رفتار بڑھاتی ہیں اور جھولے کو اونچائی پر لے جاتی ہیں اور جھولتے جھولتے ہرے بھرے درختوں اور بھورے آسمان میں دھندلا جاتی ہیں۔ کبھی کبھی رسّیوں کے بیچ ایک چھوٹا سا بستر لگا دیا جاتا ہے جس پر دو یا تین لڑکیاں بیٹھ جاتی ہیں جبکہ دو اور لڑکیاں گاتے ہوئے جھولے کو زور سے دھکا دیتی رہتی ہیں۔

گھر کے پچھواڑے برگد کے درخت پر ایک جھولا ڈالا گیا تھا۔ بدرن اور حشمت سر سے پاؤں تک لال جوڑے پہنے اس پر چڑھ گئیں۔ آنیٹ اور میں ان کو جھولا جھلا رہے تھے اور گلابیانو کرانی گا رہی تھی۔ جب وہ جھولے سے اتریں تو ہم نے باری لی۔ ہوا میں اڑنا، بادلوں کو اپنے اوپر اڑتے اور آنیٹ کے کالے بالوں کو اپنے اوپر گرتے دیکھ کر مجھے بہت فرحت بخش لگا۔ تھوڑی دیر کے لیے زندگی مجھے شادماں اور حیرت انگیز لگی۔

امّی کو بہت سی لوک کتھائیں یاد تھیں اور وہ اکثر جن بھوتوں اور پریوں کی کہانیاں سنا کر اپنے میزبانوں کو حیران کر دیتی تھیں۔ ایک دن بدرن نہا کر کھلے بالوں کے ساتھ صحن میں آ گئی۔

"میری بچّی" ماں نے کہا "بالوں کو کھلا مت رکھا کرو۔ بالوں کو ہمیشہ گانٹھ دیا کرو۔"

"ابھی میں نے سر پر تیل نہیں لگایا۔" بدرن نے کہا "اس لیے بالوں کو کیسے باندھ سکتی ہوں۔"

"شام کے وقت ٹھنڈی ہوا میں بالوں کو کھلا رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔"

"بھلا کیوں؟" بدرن نے پوچھا "جیسا تم کہتی ہو ویسا ہی کروں گی۔ بالوں کو گانٹھ لگا دوں گی۔" اس نے امّی کو یہ بتانے پر مجبور کر دیا کہ شام کے وقت بال چھوڑنا اچھا کیوں نہیں ہوتا۔

"ہوا میں جن منڈلاتے رہتے ہیں جو لمبے بالوں اور تمھاری جیسی . . .

142
www.taemeernews.com



آنکھوں والی لڑکیوں کو پکڑ لیتے ہیں۔" امّی نے کہا۔

بدرن اپنی ماں اور خاوند کے سامنے شرما گئی۔ کامران نے اپنی جوانی کے لاابالی پن کو یاد کر کے سب کو بتایا کہ ایک جن اس پر کیسے مر مٹا تھا اور وہ مسکرا دی۔

"جن کیا انسانوں کے پاس آ جاتے ہیں؟" حفیظ اللہ خان نے پوچھا۔

"لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں۔" امّی نے کہا "گو میں نے کبھی کسی جن کو دیکھا نہیں۔ لیکن میں نے لوگوں پر ان کا اثر ضرور دیکھا ہے۔"

"بتاؤ تو سہی تم نے کیا دیکھا۔" کامران جاننے کے لیے بے تاب تھی۔

"ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کے بال گھنے اور کالے تھے۔" امّی نے کہنا شروع کیا۔ "اچانک وہ بہت بیمار پڑ گئی۔ بڑھیا سے بڑھیا علاج کرانے کے باوجود بھی اس کی حالت بدتر ہوتی گئی۔ وہ کوڑے والے کیمبے کی طرح دُبلی پتلی ہو گئی۔ اس کی ساری خوبصورتی جاتی رہی سوائے اس کے بالوں کے جو مرتے دن تک خوبصورت اور ملائم بنے رہے۔ جیسے ہی اسے نیند آتی خواب اسے پریشان کرنے لگتے۔ ایک جوان جن خواب میں آتا اور اس سے کہتا کہ ایک شام کو جب وہ تنہا نہا کر اپنے بالوں کو سکھا رہی تھی تو وہ اس کے خوبصورت بالوں پر عاشق ہو گیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ شدید درد میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس کی اس مصیبت کے دوران بھی دکھائی نہ دینے والے جن نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی اور اس کی آنکھوں کی روشنی میں بیت دکھائی دینے لگی اور جب جسم مرجھا گیا تو وہ لڑکی مر گئی۔ لیکن اس کا شاندار سر پہلے کی طرح خوبصورت رہا۔"

"بڑی بھیانک کہانی ہے!" بدرن نے اپنے بالوں کو باندھتے ہوئے کہا۔

بات مختلف بھوتوں اور روحوں کی کہانیوں کے سننے سنانے میں چلتی رہی۔ کامران نے ہمیں مُنجیا ـــــ ایک نوجوان برہمن کی خیالی کہانی سنائی جو شادی سے پہلے مر گیا تھا اور پیپل کے درخت پر اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھا۔ مُنجیا جب ناراض ہوتا ہے تو آج بھی وہ درخت سے نیچے اتر کر بیل گاڑیوں، میانوں یہاں تک کہ گھوڑا گاڑیوں کو الٹ دیتا ہے۔ رات کے وقت اگر کوئی پیپل کے درخت کے پاس سے اکیلے گزرتا ہے

143
www.taemeernews.com



اور جمائی لیتا ہے تو اسے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لینا چاہیے۔

"اگر تم ایسا نہیں کروگے تو منجیا تمھارا گلا دبا کر تمھیں ختم کر دے گا۔" کامران بولی۔

اس پر امّی نے کئی طرح کے بھوتوں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ بدکار عورتوں کے بھوت یعنی چڑیلیں جو برہنہ ہوتی ہیں اور ان کے پاؤں پیچھے کو مڑے ہوتے ہیں۔ بھوت جن کے آگے کے دانت لمبے ہوتے ہیں اور وہ انسان کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں اور وہ بھوت جو جانوروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ رامپور میں کئی گاؤں ایسے ہیں۔ (امّی کے مطابق) جہاں لوگ ایک ایسے علم سے واقف ہیں جس کے ذریعے وہ بتا سکتے ہیں کہ مُردے نے اگلے جنم میں کیا شکل اختیار کی ہے۔ چتا کی راکھ کو ایک برتن میں ڈال کر رات کو باہر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کو ڈھک دیا جاتا ہے۔ اگلی صبح اس راکھ میں پاؤں کے نشان دیکھے جا سکتے ہیں جو کسی آدمی کے، پنچھی کے یا ہاتھی کے پاؤں کے ہو سکتے ہیں، یعنی جس کی شکل اس نے اختیار کی ہے۔

دس بج چکے تھے اور ہم برآمدے میں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ امّی اور کامران کے ان بدروحوں کو بھگانے کے لیے جادوئی منتر پڑھنے پر بھی ہمارا خوف دور نہیں ہوا تھا۔ میں جب سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو کروٹیں بدلتی ہی رہی اور دیواروں پر ہلتے ہوئے سایوں کو دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور حشمت کی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑیں۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہ دونوں خوف زدہ اور زرد ہو رہی تھیں۔ کامران ان کو بھی ڈرانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

"تم ٹھیک ہو ناخورشید" انھوں نے پوچھا۔ "تم ہمارے کمرے میں سونا پسند کروگی؟ وہاں محفوظ رہوگی۔ آؤ ہم تمھارا بستر ادھر لے چلتے ہیں۔"

"ہم یہیں ٹھیک ہیں۔" امّی نے احتجاج کیا۔ "لیکن ہمیں دوسرے کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بھوتوں کا گروہ ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔ خان بیگم کہانیاں سننے کے وقت گو موجود تھی لیکن اس موقع پر غائب تھی اور

144
www.taemeernews.com



سب سے پہلے وہی چلائی۔ ہم آواز سن کر اس کی طرف لپکے کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے کمرے سے باہر آ رہی ہے۔

"مریم غائب ہو گئی ہے!" وہ چلائی "خورشید اور آنیٹ بھی نہیں ہیں۔"

اور جب اس نے ہمیں اپنے کمرے سے نکلتے اور بکھرے بالوں کے ساتھ باہر آتے دیکھا تو وہ زور سے چلائی اور وہیں برآمدے میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

## سفید کبوتر

"تم اپنی پریشانیوں کو بڑی خوبی سے جھیل رہی ہو۔" ایک دن شام کو حفیظ اللہ نے امّی سے کہا۔ "تم تو بہت خوش باش، صبر والی اور مستقبل کے لیے پُر امید ہو۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ اس ماضی کا رونا رونے سے کیا فائدہ جو لوٹ کر نہیں آئے گا۔"

"مجھے تو ان کی حالت سدھرنے میں کوئی امکان نظر نہیں آتا۔" خان بیگم بولی۔ "کل ہی وہ فقیر کہہ رہا تھا کہ فرنگیوں کا اس سرزمین سے صفایا کر دیا گیا ہے۔"

"مجھے قطعی یقین نہیں ہو رہا۔" حفیظ اللہ نے کہا۔

"مجھے بھی نہیں۔" کامران بولی "حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے پاس صحیح خبریں بھی تو نہیں آ رہیں۔"

"خیر میں تمھیں بتاتا ہوں" حفیظ اللہ نے کہا "میرے چچا اگرچہ اُس دن کہہ رہے تھے کہ اب یہاں کوئی فرنگی نہیں ہے لیکن میں نے انھیں سرفراز سے رازدارانہ طور پر کہتے ہوئے سنا تھا کہ اُن کا پوری طرح سے صفایا نہیں ہوا ہے۔ پہاڑ ابھی تک فرنگیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ میرے چچا کہہ رہے تھے کہ عید کے روز عبدالرؤف خان میاں صاحب کے پاس خراجِ تحسین دینے گیا تو وہ اسی فقیر جس کا ذکر تم ابھی کر رہے تھے کی بات سن کر بڑا حیران ہوا۔

"کیا کہا تھا اس نے؟" خان بیگم نے پوچھا۔

عبدالرؤف نے بتایا : "میاں صاحب کا مزاج کچھ عجیب سا تھا۔ انھوں نے

145
www.taemeernews.com



وہ سفید پوشاک اتار پھینکی جو وہ تین مہینوں سے پہنے ہوئے تھے اور بلا کسی وجہ کے ایک کالا چُغا پہن لیا۔ عبدالرؤف دوسرے لوگوں کے ساتھ اُن کے پاس اس لیے گیا تھا کہ وہ یہ دُعا کریں کہ فرنگی دہلی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں، جانتے ہو انھوں نے کیا کہا؟"

حفیظ اللہ ڈرامائی انداز میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور کامران اور خان بیگم نے پوچھا۔ "تو انھوں نے کیا کہا؟"

"انھوں نے کہا کہ 'فرنگیوں کی حکومت کا پھر سے قائم ہونا اتنا ہی یقینی ہے جتنا روز ازل کا آنا۔ ان غیر ملکیوں کو نکالنے کے لیے سو سال لگیں گے۔ دیکھو وہ آ رہے ہیں! وہ چلایا اور شمال کی جانب اشارہ کیا جہاں سفید کبوتروں کا جھنڈ شہر کے اوپر چکر لگا رہا تھا۔ وہ ان سفید کبوتروں کی طرح آتے ہیں، جو مصیبت کے وقت اڑ جاتے ہیں اور آسمانوں کا چکر لگاتے ہیں اور پھر آرام کرنے کے لیے آجاتے ہیں۔ سفید کبوتر جو پہاڑوں سے اترتے ہیں!' عبدالرؤف ہاتھ باندھ کر میاں صاحب کے سامنے کھڑا ہو گیا اور میاں صاحب کو مزید کچھ اور کہنے سے منع کیا۔ لیکن میاں صاحب کسی کی پرواہ نہیں کرتے اور ان کی بات کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔"

کامران کے یہاں ہمارا قیام ختم ہونے کو تھا۔ ہم لگ بھگ برسات کے موسم میں انھیں مہربانوں کے بیچ رہے اور وقت کیسے بیت گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ کامران اور اس کے داماد حفیظ اللہ نے جو ہمدردی ہم لوگوں پر نچھاور کی اس سے زیادہ کی امید اور کہیں نہیں کی جا سکتی تھی۔ جاوید خان کئی بار ہم سے ملنے آیا۔ ہم سے ہی کیوں بلکہ اپنی بہن سے بھی۔ ایک دو بار اس نے کامران سے کہا بھی کہ وہ ہمیں جلد ہی واپس بھیج دے لیکن وہ ہمیں بھیجنے پر راضی نہیں ہوئی اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ہم لوگ اس کے لیے کچھ سلائی کرنے میں مصروف ہیں اور کام ابھی باقی ہے۔ جاوید نے زیادہ زور بھی نہیں دیا کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کی بیوی اور ہمارے ایک جگہ رہنے سے اس کی مشکلات بڑھ جائیں گی۔

نواب کے ملٹری کمان سونپنے کے بعد سے ہم نے نہیں سنا کہ جاوید نے کوئی نیا معرکہ سر کیا ہو سوائے روز آرم فیکٹری کو بند کروانے کے۔ اس میں بھی اس کا

146
www.taemeernews.com



فقط اپنا ذاتی مفاد تھا۔ محمدی میں شاہ جہاں پور سے بھاگ کر آئے یورپی سپاہیوں کے قتل عام میں بھی اس نے کوئی خاص جوش نہیں دکھایا تھا۔ اب اس کا کام صرف نواب کی محفلوں کو سجانے یا پھر دہلی سے ملی خبروں، ہمارے جیسے اگاڑ کا پناہ گزینوں کا اتہ پتہ بتانے تک ہی محدود تھا۔ مثال کے طور پر ہمیں ریڈ مین گھرانے کے خفیہ ٹھکانے کا پتہ چلا، ریڈ مین کی پرانی دھوبن کے گھر کے سامنے سے ایک بھکارن گزر رہی تھی کہ بھیک مانگتے ہوئے اس کی نظر احاطے میں بیٹھی ہوئی ایک لمبی خوبصورت عورت پر پڑی اور وہ اسے پہچان گئی۔

"کون ہو تم؟" اس نے کھی کھی کر کے پوچھا۔ "مجھے معلوم ہے تم کون ہو۔ تمھارا وہ سفید فام خاوند اور بیٹا کہاں ہیں؟"

"دفع ہو جا یہاں سے چڑیل!" ریڈ مین کی بیوی نے ڈانٹا۔ "جاؤ اور جا کر بھیک مانگو اور ہمارے معاملے میں دخل مت دو۔"

اتنے میں دھوبی گھر پر آگیا اور حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بھکارن سے بولا "تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ فرنگن ہے؟ یہ تو میری بھابھی ہے؟"

"تمھارے لوگوں کی ذات میں اتنی خوبصورت عورت نہیں ہوتی!" بڑھیا بھکارن نے مکاری سے کہا۔

"اگر تم نے کچھ اور کہا تو میرا یہ کپڑے دھونے والا تختہ تمھارے سر پر پڑے گا۔" دھوبی نے اسے دھمکایا۔ "چل یہاں سے مردار۔"

بھکارن لنگڑاتی ہوئی دھوبی اور ریڈ مین کے گھر والوں کو بد دعا دیتی ہوئی سیدھی عبدالرؤف خان کے گھر پہنچی اور اسے پورا قصہ سنایا۔ عبدالرؤف نے یہ خبر جا کر نواب کو دی اور فرنگن کو پکڑنے کے لیے حکم جاری کرنے کا مشورہ دیا۔

"یہ مہم تو تمھاری شایانِ شان ہو گی۔" نواب نے اس کا دل بہلانے کے لیے کہا۔ "فرنگن کو پکڑنے کے لیے تمھیں ہتھیار بند کمک کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن میں ان مہاجرین کا پیچھا کرنے کے حق میں نہیں۔ خان صاحب انھوں نے ہمارے مقصد میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی ہے۔" اس نے انھیں برداشت کرنے کی

147
www.taemeernews.com



وہی تلقین کی جیسی کہ ہمارے لیے کی تھی۔

محرم آکر چلا گیا۔ ہمیں اس کا پتہ بھی نہیں چلا کیونکہ شاہ جہاں پور میں زیادہ شیعہ لوگ نہیں تھے اور تہوار اتنے جوش و خروش سے نہیں منایا گیا تھا جتنا دوسرے شہروں میں منایا جاتا تھا۔ روزوں کے ان دس دنوں میں پٹھان عورتیں شیعہ عورتوں کی طرح ماتم نہیں کرتیں یہاں تک کہ اپنے زیور تک نہیں اتارتیں۔ شہر کے غرباء میں بانٹنے کے لیے کھانا اور کپڑے وغیرہ البتہ مسجدوں میں بھیجے جاتے ہیں۔

محرم کے ختم ہونے پر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم چار ستمبر جمعہ کے روز جاوید کے گھر چلے جائیں گے۔

## جاوید خان کی بے تابی

ہم سے کسی طرح کا سروکار رکھنے سے پہلے بچاری خان بیگم کو ابھی حسد کی آگ میں جلنا ہی تھا۔ جس دن ہم اس کے گھر پہنچے موقعہ پاکر جاوید نے امّی سے پھر میری شادی کی بات چھیڑ دی۔

"مجھے کتنا اور انتظار کرنا پڑے گا مریم؟" اس نے کھانا کھانے کے بعد پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" امّی نے آہ بھر کر کہا۔ "تم مجھ سے کئی بار پوچھ چکے ہو اور میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھائیوں سے پوچھے بغیر نہیں کر سکتی اور تم اس وقت تک انتظار کرنے کے لیے مان بھی گئے تھے جب تک دلّی کی لڑائی کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔"

"میں تو کہتا ہوں ان فرنگیوں کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔" اس نے غضبناک ہو کر کہا۔ "مجھے یقین ہے اب تک تمھارے بھائی سب ختم ہو چکے ہوں گے!" پھر اچانک اس کا مزاج غصّہ سے افسردگی میں بدل گیا اور وہ خود ہی خود بڑبڑانے لگا "شاید اس نے سچ ہی کہا تھا۔ 'صوبے دار جی تم کیا سوچتے ہو تم دلّی پہنچ جاؤ گے؟' گھنشیام کی قسمت میں دلّی کی فصیل کو پار کرنا نہیں لکھا تھا۔ فرنگیوں نے جب بریلی کی فوج پر

148
www.taemeernews.com



حملہ کیا تو وہ ہنڈن پُل پر ہی گر پڑا تھا۔ وہ بادشاہ کو 31 مئی کو ہوئی ہماری کامیابیوں کی خبر بھی نہیں دے سکا۔ میں نے جو کرنا تھا کیا ـــــ اور محرم کے وقت میٹھی روٹی نے شربت کا کام کیا۔ منگل خان کے ہاں میں نے اس لڑکے کو ختم کر دیا ہوتا مگر وہ بے وقوف منگل بیچ میں آ گیا اور کہا کہ اس نے اس لڑکے کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ ایک مومن کا کسی کافر کو اپنانے کے بارے میں تو میں نے کبھی سنا ہی نہیں تھا ـــــ لعنت ہے ان سب پر!"

اس کا چہرہ کالا پڑ گیا تھا اور ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ جب وہ گھر سے باہر گیا تو چند لمحوں کے بعد سیف اللہ کی چیخوں نے ہمیں دہلا دیا۔ سیف اللہ جاوید کا سوتیلا بھائی تھا جو گلی میں اس کے سامنے آ گیا تھا اور پٹھان اس پر اپنی ناکامی کا غصہ اتار رہا تھا۔

جاوید خان نے لڑکے کے کپڑے اتار دیے تھے اور گھوڑے والی چابک اتنی بری طرح اس پر برسائی تھی کہ اس کی پیٹھ سے چمڑی الگ ہو گئی تھی۔ سیف اللہ کئی دنوں تک زخموں کے درد کی وجہ سے بستر پر پڑا رہا۔ جاوید خان اس پر رحم کرنے کے بجائے اسے دھمکاتا رہا کہ اگر وہ کراہنا بند نہیں کرے گا تو وہ پھر چابک برسائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ امّی کے ناامید کر دینے والے جواب نے جاوید کے غصے کو بھڑکا دیا تھا اور میں سوچتی ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس کا غصہ اپنے بھائی پر اترا۔ جاوید اس سے اپنے باپ کی ناجائز اولاد ہونے کی وجہ سے بھی نفرت کرتا تھا۔

اسی شام جاوید نے اپنی سفاکانہ حرکت کا ایک اور نمونہ پیش کیا۔ وہ سائس سے پوچھ رہا تھا گھوڑے کو دانہ دیا یا نہیں۔ سائس نے اسے جب بتایا کہ نوکرانی روپیا نے دانہ پیسا نہیں تو جاوید نے روپیا کو طلب کیا اور پوچھا کہ دانہ کیوں نہیں پیسا۔

"میں دوسرے کاموں میں مصروف تھی۔" وہ بولی۔

"سچ کہتی ہے مردار؟" وہ زور سے چلایا اور پھر اپنی چابک ہاتھ میں لے کر اس پر برسانے لگا کہ اس کے جسم پر سیاہ اور نیلے نشان پڑ گئے اور اس کے پھٹے پرانے کپڑوں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ وہ بچاری کئی دنوں تک بستر پر پڑی رہی۔ گھر میں ہر کوئی ڈر رہا تھا کہ جاوید کا اگلا نشانہ کون ہو گا۔ امّی سے عورت اور لڑکے کا کراہنا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے زیبان سے پسی ہوئی ہلدی منگوائی اور آگ پر گرم کر کے اُن کے زخموں پر اس

149
www.taemeernews.com



کالیپ کیا۔ تین دن تک اس کی تیمار داری کرتی رہیں اور ان کے زخم ہرے ہونے لگے۔

ایک دن جاوید پھر امّی کے پاس آیا۔ ہم ڈر رہے تھے کہ وہ پھر اپنے غصّے کا اظہار کرے گا لیکن وہ دل شکستہ نظر آیا۔ وہ اپنے کیے پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سارے جسم میں درد کی شکایت کی اور امّی سے اس کا کوئی علاج پوچھا۔

''تم ان دونوں بد بختوں کا علاج کر رہی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میرے لیے بھی کوئی دوا ہے کہ نہیں؟''

''میں تمھیں کیا دوا دے سکتی ہوں؟'' امّی نے کہا ''میں کوئی حکیم تو نہیں۔ اگر میں اپنے ہوش میں ہوتی تو تمھارے درد کے بارے میں کوئی علاج ضرور بتاتی۔ لیکن تم بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہو۔''

''نہیں میں ٹھیک نہیں ہوں۔'' جاوید بولا ''میں اپنے گھوڑ پر پہلے کی طرح نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنے سے بہتر لوگوں کی بات کی پرواہ نہیں کی کہ جمعرات کے روز شکار مت کیا کرو۔ پچھلے جمعرات کو جب میں شکار کے لیے گیا تو مجھے ایک کالا ہرن دکھائی دے گیا اور میں نے اس پر گولی چلا دی لیکن سارہ چوک گیا۔ گولی قبر پر بیٹھے ہوئے ایک سفید کبوتر کو لگی۔ کبوتر اڑ کر ایک جھاڑی میں جا گرا مگر میں اسے ڈھونڈ نہیں پایا۔ ظاہر ہے وہ مر گیا ہوگا۔ اس دن شکار میں مجھے کچھ نہیں ملا اور جب میں شام کے وقت گھر لوٹا تو مجھے بے حد تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ میں ایک لاش کی طرح اکڑ گیا تھا۔ میں نے عبدالرؤف کو خبر بھیجی اور جب اسے قصّے کا پتہ چلا تو وہ مجھ سے ملنے آیا۔ وہ بہت ناراض ہوا کہ میں نے کبوتر پر گولی چلائی۔ 'کبوتر انسان ہوتے ہیں جو جمعرات کے دن اپنی قبروں سے نکل کر ہوا خوری کے لیے آتے ہیں۔' اس نے بتایا تھا۔ خیر عبدالرؤف نے میرا علاج کیا۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ آخر میں ہوش میں آ گیا۔ لیکن میرا چہرہ سوجا ہوا ہے جہاں مرحوم نے مجھے ضرور تھپڑ مارا ہوگا۔''

اس کے چہرے پر ہلکی سی سوجن تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ امّی اسے اچھی طرح سے دیکھ سکتیں وہ گلی کی جانب سے آ رہی سنگیت کی آواز سن کر چلا گیا۔ اس کے

150
www.taemeernews.com



چہرے پر تشدد کی علامت تھی اور وہ اپنی چابک اٹھا کر وہ باہر چلا گیا تھا۔

باہر ماحول ہنگامہ خیز تھا۔ کسی کے چلانے کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی "ہائے! ہائے! مجھے بچاؤ۔ میں مارا جاؤں گا۔"

ہم حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ خان بیگم نے کہا "یہ وہی لڑکا ہوگا جو کبھی کبھی ادھر سے بانسری پر محبت بھرے گیت گاتا ہوا گزرا کرتا ہے۔ میرے خاوند نے اپنے مرحوم باپ کی قسم کھائی تھی کہ اگر یہ لڑکا کبھی اس کے گھر کے سامنے گاتا ہوا دکھائی دے گیا تو وہ چابک مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دے گا۔"

"مگر اس کے گانے سے کسی کا کیا بگڑ جاتا ہے؟" امی نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن پٹھانوں کے علاقے میں کسی گلی کوچے میں گانے یا ساز بجانے کی اجازت نہیں۔ ساز ہر طرح کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ اسی لیے اسے ناپسند کیا جاتا ہے۔"

"تاہم ہمارے محافظ کو کیا حق ہے کہ وہ گلی میں کسی پر حملہ کرے صرف اس لیے کہ وہ بانسری بجا رہا ہے اور گا رہا ہے۔ جاوید کو اس بات کا خوف نہیں کہ اپنی اس زیادتی کے لیے اسے نواب کے سامنے جواب دہ ہونے پڑے گا۔"

خان بیگم ہنس دی۔ "نواب؟" وہ بولی "یہ تم کیا سوچ رہی ہو مریم؟ نواب بھلا ان باتوں کی کیوں پرواہ کرنے لگا؟"

## کوٹھی والی کی آمد

13 ستمبر کو اتوار کی صبح تھی جب نائی جاوید کے پاس کوٹھی والی کا پیغام لے کر آیا۔ "تمھاری چاچی نے سلام بھیجا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ وہ کل تم سے ملنے آنا چاہتی ہیں۔" جاوید نے جواب دیا "ارے یہ گھر چاچی کا ہے وہ جب چاہیں اس گھر کی رونق بڑھا سکتی ہیں۔" اس قسم کے پیغامات کے لیے بڑے شائستہ الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔

151
www.taemeernews.com



اگلی صبح کوٹھی والی میانے میں بیٹھ کر اپنے نوکروں کے ساتھ آ گئی۔ اس کے آنے کی ہمیں بے حد خوشی ہوئی کیونکہ وہ ہمیشہ دوستانہ برتاؤ کرتی تھی۔

''لو مریم، اب کچھ وقت تم میرے ساتھ گزارو۔ تم زیادہ تر وقت کامران کے گھر پر رہتی ہو اور مجھے حسد ہوتا ہے۔ جاوید، میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''بات تو ایک ہی ہے یہاں رہیں یا تمھارے ساتھ چلی جائیں۔'' جاوید نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں؟'' کوٹھی والی نے شرارتاً پوچھا۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ اگر وہ تمھارے پاس نہ رہیں تو تم ناراض ہو جاؤ گے۔''

''سچ تو یہی ہے۔ مگر اس سے فائدہ؟'' وہ بولا ''میرا مدعا تو لڑکی کو پانا تھا۔''

''تمھارے پاس ہی ہے وہ۔ ہے کہ نہیں؟'' کوٹھی والی نے کہا۔

''میرے سر کی قسم، تم مجھے غصہ دلا رہی ہو۔'' جاوید نے کہا۔ ''جب تک وہ میرے گھر میں ہے میرے قبضے میں ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ اگر اس کی ماں نے ٹال مٹول نہ کی ہوتی تو میں اس سے آج ہی شادی کر لیتا۔ کبھی وہ کہتی ہے۔ 'مجھے اپنے بھائیوں سے پوچھنا ہے۔' جیسے کہ اس کے بھائی صلاح مشورہ دینے کے لیے زندہ ہیں۔ کبھی کہتی ہے 'اس وقت تک انتظار کرو جب تک دلّی کی لڑائی ختم نہیں ہو جاتی۔' یعنی اگر لڑائی ختم بھی ہو جاتی ہے تو ہم لوگوں کو کیا فرق پڑے گا۔ یہ سوچنا کہ فرنگی لڑائی جیت جائیں گے حماقت ہی ہے۔ کیا میں نے دیکھا نہیں جب ہمارا ایک سپاہی اُن کا پیچھا کر رہا تھا تو وہ کیسے اپنی جان بچاتے پھر رہے تھے؟''

''ہو سکتا ہے مگر ہمیشہ نہیں۔'' کوٹھی والی نے کہا۔

''میں حیران ہوں چاچی کہ تم ان کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں جتا رہی ہو؟''

''اس لیے کہ میرے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا رہا ہے۔'' چاچی نے جواب دیا۔ ''جب میرا خاندد شمنوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا تو وہ کلکٹر ہی تھا جو ماتم پرسی کے لیے گھر پر آیا تھا اور اسی کی بدولت ہمارے کھیت ہم سے چھینے نہیں گئے۔ مانا کہ یہ بات اب پرانی

152
www.taemeernews.com



ہو چکی ہے لیکن میں ان کا برا کیونکر چاہوں گی مگر یہ مت سوچنا کہ میں تمھارے مقصد، میری مراد بغاوت سے ہے، اس میں کوئی برائی ڈھونڈتی ہوں۔"

"بغاوت! تم ہمیشہ اسے بغاوت ہی کیوں کہتی ہو چاچی؟" جاوید بہت پریشان لگ رہا تھا۔ "کسی کے خلاف بغاوت؟ غیر ملکیوں کے خلاف! کیا ان کو اس سرزمین سے نکال باہر نہیں کر دینا چاہیے۔ ان لوگوں سے لڑنا بغاوت نہیں بلکہ ایک قابل تعریف عمل ہے۔ ایک جنون ہے"

"ہو سکتا ہے مگر معصوم عورتوں اور بچوں کے قتل سے گریز رہے تو اچھا ہے اور یہ بھی دیکھو کہ فرنگی کس طرح دلّی پر اپنی گرفت مضبوط کیے ہوئے ہیں۔"

"بس چاچی آگے کچھ مت کہنا۔ نہیں تو میرے اندر کا شیطان جاگ جائے گا۔ ہمیں کوئی پیش گوئی نہیں کرنی چاہیے۔ دلّی ابھی قائم ہے اور اس پر بہادر شاہ کی حکومت ہے!"

"پھر بھی میں تمھیں یہی صلاح دوں گی کہ تم مریم کی بات مانو اور دلّی کا محاصرہ اٹھنے تک انتظار کرو۔ لیکن جاوید اس لڑکی سے متعلق اپنے ارادوں سے ذرا ہوشیار رہنا۔"

"بلا شک مجھے خبردار رہنا ہوگا۔ میں کانپور کی اس لڑکی کی کہانی سن چکا ہوں۔"

"کون لڑکی؟"

"وہ جنرل کی لڑکی تھی۔ اپنی عمر کے بیسویں سال میں بے حد خوبصورت۔ نانا صاحب کے محافظ جتھہ دار نرسنگھ نے اسے قتل عام سے بچایا تھا اور اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ میری طرح اس کے ارادے بھی پاک تھے۔ لیکن ایک رات ایک دوسرے افسر زرانداز خان نے اُسے جمعدار کے گھر سے اٹھالیا اور اس کے ساتھ اس قدر ظالمانہ سلوک کیا کہ اس کی رگوں میں اپنی قوم کی خودداری اور آزادی جاگ اٹھی۔ کچھ عرصے تک اس نے اپنے جذبات کو دبائے رکھا لیکن ایک رات جب وہ سو رہا تھا تو اس کے تکیے کے نیچے سے اس نے چھوٹی تلوار نکالی اور اس کے سینے میں گھونپ دی۔ بعد میں وہ خود

153
www.taemeernews.com



بھی کنوئیں میں کود گئی۔ یہ کتنی ہمت و دلیری کا کام تھا چاچی!" اور اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا "یقین مانو میں نے تو ابھی اس کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"واہ! بہت چالاک بنتے ہو!" کوٹھی والی نے مذاق میں کہا۔

کچھ وقفے کے بعد کوٹھی والی نے پھر کہا "تو یہ میرے ساتھ جا سکتی ہیں نا جاوید؟ آج صبح سویرے سے تمھارا مزاج بھی کچھ بگڑا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لے جاؤ ان لوگوں کو اپنے ساتھ۔" اس نے آزردگی سے کہا۔

"اگر وہ تمھارے ساتھ جانے میں خوش ہیں تو جا سکتی ہیں۔"

کوٹھی والی کے میانے میں بیٹھ کر ہم اس کے گھر پہنچے۔ دراصل وہ ایک حویلی تھی۔ کشادہ، اینٹوں سے بنی ہوئی۔ اونچا صدر دروازہ اور بڑا سا صحن۔ پھاٹک کے اوپر کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جن کی چھتیں شیشے کی تھیں اور وہ مردوں کی آرام گاہ تھیں۔ عورتوں کے کمرے نچلے منزل پر تھے جو ٹھنڈے اور کشادہ تھے۔

گھر میں کوٹھی والی، اس کی لڑکی اور دو لڑکے، ایک بہو، ایک داماد اور کئی پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تھیں۔ کوٹھی والی ضلع کے زمیندار کی بیوہ تھی اور اس وقت اس کی عمر چالیس سال تھی۔ دراز قد، کالے بال اور سیاہ آنکھیں، بڑا سا منہ، چھوٹے چھوٹے دانت جو مسی اور پان چبانے سے کالے پڑ گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں چاندی کا ایک ایک کڑا اور دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں معمولی سے چاندی کے چھلے کے علاوہ اس نے اور کوئی زیور نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ دمکتا رہتا تھا اور وہ بہت خوش مزاج تھی۔ اپنی برادری میں اس کی بہت عزت تھی اور لوگ مصیبت میں صلاح مشورے کے لیے اس کے پاس آتے تھے۔

امّی اس گھر کی چہیتی بن گئیں۔ اسی طرح آنیٹ اور میں بھی لیکن ذرا کم۔ کوٹھی والی ہمارا خاص خیال رکھتی تھی۔ "کتنی چپ چاپ ہیں یہ لڑکیاں! وہ فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں۔"

ایک دن وہ امّی سے کہنے لگی: "ان لڑکیوں کے کان اور ناک کیوں نہ

154
www.taemeernews.com



چھدوا دیے جائیں؟"

"جب میرے پاس ان کے پہننے کے لیے دینے کو کچھ نہیں تو ناک کان چھدوانے کا کیا فائدہ؟" امّی نے جواب دیا۔

ہمارے کانوں کی لویں تو پہلے ہی چھدی ہوئی تھیں اور میں خوش تھی کہ میری ناک نہیں چھیدی جائے گی۔

"یہ اچھا ہوا کہ تم نے اپنی لڑکی کے لیے جاوید کی پیش کش کو نہیں مانا۔" کوٹھی والی نے کہا۔ "میری کوئی لڑکی ہوتی تو میں بھی نہ مانتی۔ جاوید بے حد بے وفا ہے۔"

"یہ ایک بڑا بے جوڑ رشتہ ہوتا۔" امّی نے کہا۔ "میرا خاوند کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کسی پٹھان کے گھر میں دوسری بیوی بن کر رہے۔"

ہم باتیں کرتے رہے تھے کہ کوٹھی والی کا بڑا لڑکا وجیہ اللہ خان آکر بیٹھ گیا۔ وہ پچیس سال کا نوجوان تھا اور حافظ تھا ـــــ یعنی قرآن حفظ کیے ہوئے تھا ـــــ اور باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا۔ پڑوس کی مسجد میں وہی اذان دیا کرتا تھا۔ صاف رنگ، درمیانہ قد، مسکین اور عزت آبرو والا تھا۔ وہ اکثر اوپر بیٹھک میں بیٹھ کر زیادہ تر اپنا وقت پڑھنے اور شطرنج کھیلنے میں صرف کرتا۔ شطرنج کا رواج اب کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ اپنے دوست کدو خان کے ساتھ آیا تھا جو کوٹھی والی کو چاچی کہتا تھا۔ میں شاید اس کو پہچان رہی تھی۔ وہ بھی اس گروہ میں شامل تھا جس نے ہمیں رام جی لال کے گھر سے زبردستی نکالا تھا۔ وہ دِق کا مریض تھا جو شاید ابھی شروع ہی ہوئی تھی اور وجیہ اللہ اور کوٹھی والی دونوں امّی سے اس کا علاج کرنے کو کہہ رہے تھے۔

"میں کوئی ڈاکٹر نہیں" امّی نے کہا "صرف چھوٹی موٹی بیماری کا علاج کر سکتی ہوں۔ افسوس کہ اس لڑکے کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"ایسا مت کہو کہ تم کچھ نہیں کر سکتیں۔" وجیہ اللہ نے اصرار کیا۔ "لڑکا بڑا جانباز ہے اگرچہ ابھی اسے اپنے کاموں سے شہرت نہیں ملی۔"

155
www.taemeernews.com



''اس بیچارے کا مذاق تو مت اڑاؤ۔ وہ تو پہلے ہی افسردہ ہے۔'' کوٹھی والی نے کہا۔

''نہیں۔ میں خالا کو پہلے اس کے اچھے کارناموں سے واقف کراؤں گا پھر اس کی حالت سدھارنے کے لیے مدد کے لیے کہوں گا۔''

کدّو خان پہلے سے بھی زیادہ پریشان لگ رہا تھا۔ بوکھلاہٹ میں اس نے اپنا خوبصورت سر نیچے جھکالیا۔

''پہلی بات تو یہ کہ خالا یہ وہی نوجوان ہے جس نے نواب قادر علی خان کو عیسائیوں کے مقبرے کھودنے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہاں خزانہ دبا ہوا ہے۔''

کدّو خان نے سر اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ''مجھے ایسا بتایا گیا تھا اور وہ بزدل جس نے مجھے یہ خبر دی تھی کہتا تھا کہ جب کسی فرنگی کو دفنایا جاتا ہے تو اس کی قبر میں دو بورے بھر کر روپے رکھ دیے جاتے ہیں۔''

''اور تم نے اس بے ہودہ کہانی پر یقین کر لیا اور ان کی ہڈیاں تک کھود ڈالیں۔ بتاؤ تو کون سا خزانہ ڈھونڈ نکالا تم نے؟''

''کھدائی ہم نے رات کے وقت شروع کی تھی۔'' کدّو خان نے خود ہی بتانے میں بہتری سمجھی۔ ''چاندنی رات تھی۔ ہم تین لوگ تھے۔ قبر میں اترنے کے لیے میں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ سوچ کر اگر کوئی قیمتی چیز ملی تو نکال لاؤں گا۔ اپنے دوستوں سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے میں نے زمین میں ایک کھونٹی گاڑ دی اور ایک رسّی اس کے ساتھ باندھ دی جس کو پکڑ کر میں قبر میں اتر گیا۔ لیکن میرے خوف کا ذرا اندازہ لگائیے۔ میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑے اور میں دوزخ اور زمین کے بیچ میں لٹک گیا۔ میرے منہ سے ایک خوف ناک چیخ نکلی۔ میرے ساتھیوں نے یہ سوچا کہ فرنگیوں کی روحیں ان کا پیچھا کر رہی ہیں، میری مدد کرنے کے بجائے وہاں سے دُم دبا کر بھاگ نکلے اور میں قبر کے اندر جھولتا رہا۔''

''تمھارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔'' وجیہ اللہ نے کہا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ تم

156
www.taemeernews.com



باہر کیسے آئے؟"

"میں نے رسّی کو پکڑے رکھا اور بڑی مشکل سے کنارے پر آگیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے پیچھے بھاگا جیسے ہی میں نے دوڑنا شروع کیا مجھے ایسا لگا کہ کسی نے مجھے کمر سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ میں نے پھر اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی اور پھر زمین پر پٹک دیا گیا۔ ڈر سے میں نیم مردہ ہو چکا تھا۔ میں نے آخری بار کوشش کی۔ اس دفعہ لکڑی کی کھونٹی بھی اکھڑ گئی اور میں وقت ضائع کیے بغیر وہاں سے بھاگ نکلا۔ چاچی قبرستان فرنگی روحوں سے بھرا پڑا ہے۔"

"بڑے ہی کوڑھ مغز آدمی ہو تم!" وجیہ اللہ نے مزے لیتے ہوئے کہا۔ "کوئی تو یہی سوچے گا کہ تمھاری اس کھوپڑی میں کچھ تو عقل ہو گی۔ یہ تمھارا کمر بند تھا میاں کدو جو کھونٹی کے ساتھ بندھ گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے تم قبر کے اندر لٹکے رہے اور اسی کی وجہ سے تم پتھر زمین پر پٹک دیے گئے اور جب تم نے کھونٹی کو اکھاڑ پھینکا تو تمھارا کمر بند بھی ڈھیلا پڑ گیا۔"

کدو خان کی شکست پر کوٹھی والی اور ہم سب لوگ خوب ہنسے۔

"اس بات سے تمھیں سبق لینا چاہیے کہ موت کے وقت سب برابر ہوتے ہیں۔" کوٹھی والی نے کہا۔ "کیا تم چاہو گے کہ خزانے کی تلاش میں تمھارے مرنے کے بعد تمھاری قبر کو کھودا جائے؟ خزانہ۔ واہ! بادشاہ لوگ بھی مرتے وقت خالی ہاتھ جاتے ہیں۔ بچہ بند مٹھی لیے پیدا ہوتا ہے اور وہی ہاتھ کھلا ہوتا ہے جب موت کا فرشتہ اسے لینے آتا ہے۔ ہم نہ تو دنیا میں کچھ لے کر آتے ہیں اور نہ کچھ لے کر جاتے ہیں۔"

اس موقع پر کدو خان کی ماں اور بہن بھی آگئیں اور ہاتھ جوڑ کر امّی سے کدو خان کا علاج کرنے کی درخواست کرنے لگیں۔

امّی کے علاج کرنے کی صلاحیتوں کے بارے میں انھوں نے کچھ بڑھ چڑھ کر سُن رکھا تھا۔ امّی نے اسے ہر چھ گھنٹے بعد خاکسیر کی چائے پینے کا مشورہ دیا اور ترش اور گرم چیزوں سے پرہیز رکھنے کو کہا۔ ہر صبح ناریل کا پانی پینے اور کچا ناریل کھانے کا مشورہ

157
www.taemeernews.com



بھی دیا۔ کدّو خان نے اس معمولی سے علاج پر عمل کیا اور ہمیں پتہ چلا کہ وہ آخر کار تندرست ہو گیا۔

## دہلی کی شکست

ہم کوٹھی والی کے ساتھ برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ برابر کی برساتی میں جہاں کچھ مرد بھی بیٹھے تھے، کچھ ہل چل سنائی دی۔ جاوید خان گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور اس نے سرفراز کے کان میں کچھ کہا۔ سرفراز فوراً کوٹھی والی کے پاس آیا اور اس سے کچھ کہا۔ اس کے جاتے ہی کوٹھی والی نے امّی سے کہا۔ ''سنو مریم دہلی پر فرنگیوں کا قبضہ ہو گیا ہے اب بہت کچھ ہونے والا ہے۔''

اس خبر کو سنتے ہی ہم لوگ خوشی سے اچھل پڑے۔ ہماری آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ اُدھر فرنگیوں کی فتح ہو گی اِدھر ہماری قید اور ماتحتی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن دہلی چونکہ شاہ جہاں پور سے کافی دور تھی اس لیے ہم نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور اس کے برعکس امّی نے کوٹھی والی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''پٹھانی، اب تم بھی امن چین سے رہو گی۔''

''جاوید خان تو اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گا! ہے نا؟'' کوٹھی والی نے خوشی سے کہا۔ اس خبر نے اس پر کوئی نمایاں اثر نہیں کیا تھا۔ اسے تو چند لوگوں سے مطلب تھا نہ کہ برادری سے۔ لیکن اس کی پریشانی کی وجہ بھی تو ہے۔ فرنگی اس شہر میں بدلا ضرور لیں گے۔''

اگلے ہی دن مردانے میں بڑی لمبی چوڑی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ جانے کا مشورہ دے رہے تھے جبکہ دوسرے انتظار کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کو کہہ رہے تھے۔

سرفراز کہہ رہا تھا ''دہلی پر اگرچہ فرنگی فوج کا قبضہ ہو گیا ہے لیکن ہمارے اس چھوٹے سے شہر تک پہنچنے میں انھیں کافی وقت لگے گا۔ ہمارے سپاہی جنھوں نے دہلی

158
www.taemeernews.com



میں شکست کا سامنا کیا ہے دوسری جگہ مثلاً لکھنؤ میں مقابلہ کر سکتے ہیں اور شاہ جہاں پور میں کسی فوج کے پہنچنے میں تو مہینے لگ جائیں گے۔ بھاگنے کی اتنی جلدی بھی کیا پڑی ہے، جب تک انتقامی فوج سے ڈرنے کی کوئی اور خاص وجہ نہ ہو تو۔۔۔" جاوید کہہ رہا تھا "ہاں بالکل ٹھیک کہا تم نے بھائی۔ میں نے کوئی ڈرنے والا کام تو کیا ہی نہیں۔ کیوں؟ کیا کیا ہے میں نے؟ یہ تو عبدالرؤف جیسے لوگ تھے جو پہلے فرنگی کی نوکری میں تھے اور بعد میں باغیوں میں شامل ہو گئے۔ پھانسی تو انہی لوگوں کو لگے گی۔ جہاں تک میری بات ہے، میں نے تو فرنگیوں کا نمک تک نہیں چکھا۔ اگر بدترین صورت پیش آئے گی تو میں نیپال بھاگ جاؤں گا یا پھر گوالیار کی فوج میں نوکری کر لوں گا۔"

سرفراز : "اوہ! مجھے یقین ہے تم ایسا ہی کرو گے۔ لیکن اگر کوئی خطرے کی بات نہیں ہے تو شہر چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

حفیظ اللہ : "میں نے اپنے کچھ آدمیوں کو دیکھا ہے جو دہلی سے لوٹ آئے ہیں۔ وہ بھاگ نکلنے میں خوش قسمت تھے۔ اب وہ بالکل پھٹے حال ہیں۔"

"دہلی کی جنگ کے بارے میں انھوں نے کچھ بتایا؟" سرفراز نے پوچھا۔

"ان لوگوں نے بتایا کہ ہماری فوج انگریزی لائنوں میں جو پہاڑی پر مورچہ بند تھی، نقب لگانے میں ناکام رہی۔ بہت سے دھاوے بولے گئے۔ شہر کی تسخیر سے کچھ ہی دن پہلے آخری دھاوے میں ہمارے آدمی بڑے شجاعت اور مردانگی سے لڑے لیکن ان کو پسپا کر دیا گیا اور ایک ایک آدمی کو مار ڈالا گیا۔ فرنگیوں کے بھی بہت سے آدمی مارے گئے۔ لیکن فتح نے ان کے حوصلے بلند کر دیے۔ جب ان کی بڑھتی ہوئی فوج فصیل کے پاس آ پہنچی اور کشمیری دروازے کو اڑا دیا تو ان کے سردار نکلسن کو ایک اونچی جگہ سے اپنی تلوار کی نوک پر رکھے رومال کو ہلاتے دیکھا گیا۔ اس کے ایک گولا لگا اور وہ وہیں گر گیا۔ لیکن اس کے آدمی سنگینوں سے لڑتے ہوئے شہر میں گھس آئے اور دہلی فرنگیوں کے قبضے میں آ گئی۔"

"بادشاہ کا کیا ہوا؟" سرفراز نے پوچھا۔

"بادشاہ قید کر لیا گیا اور اس کے بیٹے جو اس کے ساتھ بھاگ گئے تھے گولی

159
www.taemeernews.com



سے آزاد ہے گئے۔"

"تو یہ تھا جدو جہد کا اختتام" سر فراز خان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "دلی شہر جو پھولوں کا گلستان تھا، اب ایک اجڑا دیار ہے۔ اس اجنبی شہر میں نہ ہی کوئی میرا دشمن تھا اور نہ ہی کوئی میرا دوست۔۔۔"

"زیادہ جذباتی اور شاعر مت بنو سر فراز۔" جاوید نے چڑھ کر کہا۔ "میرے گھر پر ان لوگوں کے قتل کے لیے کون آیا تھا؟"

"وہ میں تھا۔" سر فراز نے کہا۔ "لیکن کیا میں نے کسی کا قتل کیا؟"

# پسِ پردہ

موسمِ سرما کی ابتدا تھی۔ ابھی ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ امّی نے اپنے زیورات کے بکسے میں سے جسے میں جلتے ہوئے گھر سے نکال کر لائی تھی چاندی کے دو چمچ بیچ ڈالے تاکہ سردی سے بچنے کے لیے رضائیاں اور گرم کپڑے بن جائیں۔

جب سے ہم نے دہلی کی شکست کا سنا تھا، ہمارے نظریے اور امیدوں میں تبدیلی آگئی تھی۔ ہم اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب شاہ جہاں پور میں پھر انگریزی حکومت قائم ہو جائے گی اور ہماری یہ قید بھی ختم ہو جائے گی جو کوٹھی والی، کامران اور ان کے گھر کے افراد نے ہمیں محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ تاہم ہمیشہ کے لیے اس حال میں رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہمیں امید تھی کہ ہم پھر امّی اور پاپا کے خاندان کے لوگوں میں جا ملیں گے اور جاوید کا میرے ساتھ شادی کرنے کا منصوبہ بھی دھرا رہ جائے گا۔ انگریزی حکومت کے دوبارہ قائم ہونے سے ہمارا فائدہ ذاتی تھا۔ پچھلے چند مہینوں میں ہم یہ سمجھ چکے تھے کہ غیر ملکی حکومت سے لوگوں میں بے حد ناراضگی تھی اور ظاہراً آپسی حکومت کا جاری رہنا دونوں طرفین کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن فی الحال اس حکومت کا دوبارہ قائم ہونا ہمارے حق میں تھا،

160
www.taemeernews.com



کیونکہ ہماری زندگیاں اسی پر منحصر تھیں۔

لیکن ابھی تک انگریزی فوج کے پہنچنے کے لیے کوئی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ انگریزی فوج دیر سویر ضرور پہنچ جائے گی۔ اس لیے ہم اس موضوع پر بات تک نہیں کرتے تھے نہ ہی اس بات میں مصلحت سمجھتے تھے کہ جاننے کی کوشش کریں کہ دوسری جگہوں پر کیا ہو رہا ہے۔ کوٹھی والی کی ہمدردی پر ہمیں بھروسہ تھا لیکن خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں جاوید اپنی شکست و ناکامی کی وجہ سے ہم لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

ایک روز محلّے کی جمعدارنی بیمار پڑ گئی تو اس نے ایک دوسری لڑکی کو اپنی جگہ کام کے لیے بھیج دیا۔ وہ لڑکی دیکھتے ہی ہمیں پہچان گئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی امّی سے بات ہو گئی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کا نام ملیا تھا اور جب میں چھوٹی تھی تو اس کی چھوٹی بہن سے کھیلا کرتی تھی۔

بیت الخلاء ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم راز کی بات کر سکتے تھے اور جیسے ملیا بیت الخلاء کی دیوار کے پیچھے گئی امّی وہاں پہنچ گئیں۔

"موسی، اب تمھیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ملیا نے امّی کے کان میں کہا۔ "دلّی فتح ہو گئی ہے۔ جلد ہی تمھارے اپنے یہاں آجائیں گے۔ میں تمھیں یہ بھی بتادوں کہ تمھارا بھائی بھرت پور میں محفوظ ہے۔ اگر تم اس کے پاس پیغام بھیجنا چاہتی ہو تو ایک آدمی یاترا پر متھرا جا رہا ہے، وہ تمھارا خط لے جائے گا۔"

امّی کو ایک واقف کار سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور اس پر بھروسہ کرتے ہوئے قاصد کو خط دینے کے لیے وہ راضی ہو گئیں۔

"لیکن میں خط لکھوں گی کیسے؟" امّی نے پوچھا۔

"فکر مت کرو۔" ملیا نے کہا "کل میں کاغذ پنسل لے کر آؤں گی۔ کل مجھے اسی جگہ ملنا۔"

اس مبارک ملاقات پر ہم نے اپنے احساسات کو ظاہر نہیں ہونے دیا، نہ کسی نے ہمارے برتاؤ میں کوئی تبدیلی دیکھی۔ ہم نے آنیٹ اور نانی پر بھی اس کا انکشاف

161
www.taemeernews.com



نہیں کیا کہ کہیں ہماری امیدوں پر پانی نہ پھر جائے۔

اگلے روز، حسب وعدہ ملیا آئی اور پردے کے پیچھے امّی کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے امّی کو کاغذ کا ایک ٹکڑا اور ایک چھوٹی سی پنسل پکڑا دی۔ امّی نے یہ عبارت لکھی ''میں، روتھ، آنیٹ اور امّی زندہ ہیں اور یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ جیسے بھی ہو سکے ہمیں یہاں سے نکالو۔''

یہ پرچہ اس نے مُلیا کو دیا جس کو اس نے اپنے بلاؤز میں چھپا لیا۔ وہ وہاں سے آنکھ بچا کر نکل گئی اور ہم نے اپنے برانگیختہ جذبات کو روکے رکھا۔

جنوری کا مہینہ شروع تھا اور کوٹھی والی کے پاس رہتے ہوئے ہمیں تین مہینے گزر گئے تھے۔ ہم نے کسی چیز کی خواہش نہیں کی۔ پھر بھی بڑی شفقت اور لحاظ سے ہمارا خیال رکھا گیا۔ یہاں تک کہ جب یہ کہا گیا کہ ہم جاوید خان کے یہاں چلے جائیں تو ہم بہت ناامید ہو گئے۔ وہ خود وہاں آیا اور کوٹھی والی سے ہمیں بھیجنے کو کہا۔ شاید اسے اب بھی امید تھی کہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے امّی کو راضی کر لے گا۔ انگریزوں کو دلّی فتح کیے ہوئے مہینوں گزر گئے تھے لیکن شاہ جہاں پور میں ان کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔

ادھر خان بیگم ہمارے لوٹنے پر خوش نہیں تھی اور وہ حسد کے مارے جلی بھنی رہتی تھی۔ لگتا تھا اس کی جاوید سے کچھ کہا سنی ہوئی تھی کیونکہ ہمارے پہنچنے کے اگلے روز صبح جاوید اس سے غصّے میں کہہ رہا تھا: ''مجھے تمھاری یہ روز روز کی چق چق پسند نہیں۔'' جس پر اس کی بیوی نے جب بھی جواب دیا تو جاوید کی ایک چابک نے اُسے خاموش کر دیا۔

وہ کسی سے بات کیے بنا گھر سے چلا گیا اور شام کو کھانے کے وقت ہی لوٹا۔ اس نے خان بیگم سے پوچھا کہ اُس نے کچھ کھایا یا نہیں۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''تو بیٹھو یہاں اور کچھ کھالو'' وہ بولی ''اور زیادہ پھیلنا نہیں۔'' وہ جانتی تھی کہ جاوید غصّے میں ہے اور اس کی چابک سے اسے ڈر لگتا تھا۔ اُس نے وہی کیا جو جاوید نے کہا چاہے وہ افسردہ اور روٹھی سی تھی۔ کوٹھی والی آئی اور ہمیں پھر اپنے ساتھ لے گئی۔

162
www.taemeernews.com



# بجھ پوری کی لڑائی

اپریل 1858 کا وسط تھا۔ موسم سرما کی گرم ہوائیں گرداب کے ساتھ کوٹھی والی کے برآمدے میں مار کر رہی تھیں۔ دروازے کے باہر گل موہر کے درخت پر گلنار کے پھولوں کی بہار تھی۔ آم کے درختوں پر بور آچکا تھا اور اچھی فصل کی امید تھی۔

کوٹھی والی کے یہاں جاوید کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی اور ان دونوں میں چپکے چپکے بات ہوتی رہتی تھی۔ ہم اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ انگریزوں نے شاہ جہاں پور پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو ہمارے ساتھ یہ لوگ کیسا سلوک کریں گے۔

ایک روز کوٹھی والی کے پاس ایک شخص آیا جسے ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا نام فیض اللہ تھا اور وہ بھی کوٹھی والی کو چاچی کہتا تھا اگرچہ اس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا نوجوان تھا اور فتح گڑھ میں ہوئے واقعات بیان کر رہا تھا جہاں سے وہ آیا تھا۔

''تو تم بجھ پوری کی لڑائی کے وقت وہیں موجود تھے؟'' کوٹھی والی نے پوچھا۔

''ہاں چاچی۔'' وہ بولا۔ ''کتنی زبردست لڑائی تھی! ہم انگریزوں سے دست بدست لڑ رہے تھے اور انھیں اپنی طاقت کا احساس دلا دیا تھا۔ میں نے مقتولوں کا ڈھیر لگا دیا اور نواب کو پیش کرنے کے لیے اپنے ساتھ سروں کی ایک لڑی بنا کر لایا ہوں۔''

''کتنے جھوٹے ہو تم۔'' کوٹھی والی نے کہا۔

''میرے سر کی قسم چاچی۔''

''تمھارے جیسا دُبلا پتلا آدمی اتنے سر بھلا کیسے اٹھا سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں میں نے ان کو اپنے گھوڑے پر ڈالا اور فتح کا جشن مناتا ہوا گھر پہنچا۔''

''تو لڑائی میں سب سے زیادہ نقصان کس کا ہوا؟''

163
www.taemeernews.com



"کافروں کا اور کس کا چاچی۔ ہم نے ان کا پوری طرح سے صفایا کر دیا۔" اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ پر رکھا۔

"اچھا۔" کوٹھی والی نے کہا۔

"ایک بھی آدمی نہیں بچا چاچی اور جانتی ہو انھوں نے کیا کیا؟ انھوں نے اپنی عورتوں کو ہم سے لڑنے کے لیے بھیجا۔"

"یہ تو بڑی حیران کن بات ہے!" کوٹھی والی بولی۔ "تم تو بڑے ہوشیار لڑکے ہو فیض اللہ۔ کیا تصور پایا ہے تم نے! اچھا یہ تو بتاؤ ان کی عورتیں کیسی لگتی تھیں؟"

"وہ عورتیں کیا تھیں، دیو تھیں۔ کئی عورتوں نے تو نقلی ڈاڑھی اور مونچھیں لگا رکھی تھیں۔ لیکن ہر ایک نے اونچا لہنگا پہنا ہوا تھا اور اس پر دھات کا پترا ٹانگ رکھا تھا؛ (اچانک مجھے دھیان آیا کہ فیض اللہ اسکاٹ لینڈ کے بینڈ والوں کا ذکر کر رہا تھا) یقین مانو بڑی خوفناک قسم کی عورتیں تھیں وہ۔ ظاہر ہے ان سے لڑنے کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ عورتوں پر بھلا میں کیسے ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ بس متنفر ہو کر میں نے کیمپ چھوڑ دیا اور چلا آیا۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" کوٹھی والی نے کہا۔ "فرنگیوں کے جو تم سر لائے ہو ایک دکھاؤ تو سہی۔"

"میں تمھیں ضرور دکھاتا چاچی، لیکن یقین کرو ساری کی ساری لڑی میں نے نواب کے سامنے پیش کر دی۔"

فیض اللہ کے صحیح سلامت گھر لوٹنے سے ہمیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ انھیں انگریزوں کے ہاتھوں فتح گڑھ میں شکست نہیں ہوئی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب انگریز فوج شاہ جہاں پور میں جلد ہی داخل ہو جائے گی کہ اسی وقت سرفراز نے داخل ہو کر اس بات کی تصدیق بھی کر دی۔ وہ نفرت بھری نظروں سے فیض اللہ کی طرف دیکھ کر بولا: "تو یہ جانباز آپ لوگوں سے اُن فرنگیوں کے بارے میں کہہ رہا تھا جن کے سر اس نے قلم کیے۔ کیا یہ بتا سکتا ہے کہ نظام علی خان کا سر کس نے قلم کیا؟"

اس خبر نے کھل بلی مچا دی اور کوٹھی والی اچھل پڑی اور بولی "نظام علی مارا گیا

164
www.taemeernews.com



ہے! کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟"

نظام علی خاں نواب کا بے حد عزیز ملازم تھا۔ اعتدال پسند اور باعزت آدمی۔ ایک دفعہ ہم نے اس کی حویلی کرائے پر لی تھی۔ ہم نے ہمیشہ اسے بڑا شائستہ اور ہمدرد پایا تھا۔

"میں بالکل درست کہہ رہا ہوں۔" سرفراز نے کہا۔ "میرے پاس اس بات کا ثبوت ہے۔ میں اس شیخی خورے کی طرح بڑائی نہیں مار رہا ہوں۔ نظام علی کے گھر پر صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں لڑکے بھی زخمی ہو گئے ہیں۔ ایک کے سر پر چوٹ لگی ہے تو دوسرے کے ٹانگ پر۔"

فیض اللہ کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھوں نے جو بندوق کے پٹے سے کھیل رہے تھے حرکت کرنا بند کر دی تھی۔

نواب نے نظام علی کی کمان میں ایک بڑی فوج بھیجی تھی اور ہدایت کی تھی کہ فرنگیوں کو گنگا پار کرنے سے روکے۔ لیکن وہ اس قدر سست اور بے ڈھنگے تھے کہ دشمن کی فوج دو دفعہ ہمارے شہر پر چڑھ آئی اور نظام علی کو پتہ ہی نہیں چلا۔ فرنگی فوج اپنے کیمپ تک پہنچ چکی تھی جب آسمان میں انھیں گرد و غبار اڑتا دکھائی دیا۔ ان کے جاسوسوں نے آکر خبر دی کہ نواب کی فوج نے ان پر چڑھائی کر دی ہے۔ اسی وقت گھوڑ سوار فوج کو میدانِ جنگ میں اترنے کا حکم ہوا۔ نواب کی فوج ابھی صف آرائی کر رہی تھی کہ انگریزوں نے ان پر حملہ بول دیا اور بندوقوں سے ساری فوج کا صفایا کر دیا۔ اس اچانک حملے سے ہماری فوج کے حوصلے پست ہو گئے۔ خوف و ہراس سے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔"

"اور نظام علی کا کیا ہوا؟" کوٹھی والی نے پوچھا۔

"اس نے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کرنے کی مایوس کن کوشش کی تاکہ وہ فرنگیوں کا مقابلہ کر سکے لیکن بے سود۔ وہ اپنے آدمیوں کو مقابلے کے لیے اکٹھا کرنے کے لیے ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ یہ ذلت اس سے برداشت نہیں ہو پائی اور وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور اپنے ملازم کو اپنے سینے میں تلوار گھونپ دینے کے لیے کہا۔

165
www.taemeernews.com



لیکن ملازم نے اس کی بات نہیں مانی۔ نظام علی پھر دیوانہ وار بھاگا اور جا کر توپ کے دہانے کے آگے اپنا سر رکھ دیا اور توپچی سے کہا کہ آگ کا فلیتہ لگا کر اس کو اڑا دے۔ لیکن توپچی نے بھی انکار کر دیا۔ بے چارہ نظام علی! وہ اپنے تیز چھرے سے خود پر وار کرنے والا تھا کہ فرنگی گھوڑ سوار فوج ہر چیز کا صفایا کرتی ہوئی آ پہنچی۔ اس گھوڑ سوار فوج کے ایک آدمی نے اسے پہچان لیا۔ اس کی مخصوص وضع قطع سے اس کو پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا اور بھالا مار کر اسے زمین پر گرا دیا اور اس طرح سے ایک ایسے آدمی کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا جو عبدالرؤف خان سے زیادہ پکے ارادے اور شخصیت کا مالک تھا اور نوابی شان کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ میرے خیال میں نواب کی حکومت اب بس ہفتہ بھر کی اور ہے۔"

"مجھے اس کی موت کا سخت افسوس ہے۔" کوٹھی والی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اس کے بیٹوں کا کیا حشر ہوا؟ تم کہہ رہے تھے کہ وہ تو زخمی ہو گئے تھے۔"

"اچھا تو یہ ہوتا کہ وہ بھی اپنے عالی ظرف باپ کی طرح مارے جاتے، بدقسمتی سے وہ بھی بھگوڑوں میں شامل ہو کر تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے، جیسے میرا یہ دوست فیض اللہ۔ میں انھیں بھی سر پیٹتے اور بوڑھی عورتوں کی طرح اپنی بدقسمتی پر روتے ہوئے چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"تم تو واقعی بڑی بھیانک خبر لے کر آئے ہو۔" کوٹھی والی نے کہا "اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو فرنگی فوج جلدی ہی یہاں پہنچ جائے گی۔ اس وقت ہمارا کیا ہو گا؟"

"اس میں کوئی شک نہیں وہ ادھر کی طرف ہی بڑھ رہے تھے اور یقیناً جلدی ہی شہر پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ ہمیں اپنے بچاؤ کے لیے سوچنا چاہیے۔۔۔ کیونکہ فوراً شہر کو تاخت و تاراج کرنے کا حکم جاری ہو جائے گا جیسا کہ انھوں نے دلّی میں کیا۔ ان کے پاس یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔"

"خدا نہ کرے۔" کوٹھی والی چیخی۔ "آج سب لوگ میرے یہاں اکٹھا ہوں تاکہ بچاؤ کا کوئی راستہ نکالا جائے۔ ہمیں اب وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے کیونکہ کل تو فرنگی فوج ضلع میں گھس آئے گی اور پرسوں شہر میں آ جائے گی۔"

166
www.taemeernews.com



اس طرح کوٹھی والی جو بغاوت کے دوران امن و چین سے اپنے گھر پر رہی اب اپنے سردار ہونے کی صلاحیت دکھا رہی تھی۔ وہ ان بے ضابطہ اور بے ترتیب لوگوں کو اس طرح حکم دے رہی تھی جیسے وہ بچے ہوں۔ اس طرح سے ان میں اس نے تنظیم کا احساس پیدا کیا، نہیں تو وہاں افراتفری کا عالم ہوتا۔

## پھر وہی فرار

اس شام کوٹھی والی نے امّی سے کہا۔ "سنا مریم۔ فرنگی آ رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہے تم میرے ساتھ ہو۔ اگر ہمیں شہر سے بھاگنا پڑا تو تم ہمارے ساتھ چلو گی۔ چلو گی نا؟"

"ہاں" امّی نے کہا۔ "وہ لوگ کیسے جانیں گے کہ ہم کون ہیں؟ ان میں ہمارا کوئی تو ہوگا نہیں جو ہمارا استقبال کرے گا اور ہماری حفاظت کرے گا۔ ہمارے رنگ و روپ اور ہماری پوشاکوں سے کوئی بھی ہمیں مسلم سمجھ سکتا ہے اور ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو دوسری عورتوں کا۔ ابھی تو ہماری شناخت تم سے ہے۔ اس لیے جہاں تم جاؤ گی ہم تمھارے ساتھ چلیں گے۔"

جب کوٹھی والی نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ شاہ جہاں پور سے چلے جائیں گے لیکن پہلے جاوید خان کے گھر پر سب اکٹھا ہوں گے۔ اسی شام ہم جاوید کے گھر پر چلے گئے۔ 28 اپریل 1858 کے دن لگ بھگ تیس لوگوں نے ڈیرہ ڈال دیا۔ ان میں کوٹھی والی کے گھر کے لوگ، کامران کا کنبہ، ایک ڈاکٹر اور اس کے بال بچے جن کو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جاوید اور اس کے گھر کے لوگ تھے۔ اس واقعے کو تقریباً ایک سال ہو گیا تھا جب ہم جلتا ہوا گھر بار چھوڑ کر آئے تھے۔ بہت جلد جاوید کا گھر بھی جل جائے گا۔ اب سب بے معنی تھا اور میں سوچتی ہوں کہ عام آدمی کے لیے لڑائی بے معنی ہے۔

اس رات ہم سو نہیں پائے کیونکہ دیر تک ایک کے بعد ایک میانہ اتر تا رہا اور

167
www.taemeernews.com



ہر کوئی کانا پھوسی اور راز کی باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ یہ طے پایا کہ ہم لوگ شمال کی جانب جائیں گے، کیونکہ انگریزی فوج جنوب کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس لیے 29 تاریخ کی صبح کو لوگوں نے میانوں میں بیٹھنا شروع کر دیا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ایک میانے میں جگہ مل جائے گی لیکن جلد ہی سارے میانے بھر چکے تھے اور اب ان میں مزید جگہ نہیں تھی۔

جاوید ہمارے پاس آیا اور بولا : "مریم تم لوگ تو ڈاکٹر کی بیل گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ وہاں آرام رہے گا۔"

ہمارے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم چاروں نانی، امّی، آنیٹ اور میں بیل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر کی بیوی، دو سالیاں اور اس کے بھائی کی بیوی او بچے تھے۔ قافلہ چل پڑا۔ مرد لوگ آگے آگے گھوڑوں پر تھے، جبکہ میانہ بردار آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ سب سے پیچھے ہماری بیل گاڑی چل رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد ہم لوگ ایک گاؤں میں پہنچے جو شاہ جہاں پور سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ ہم نے بیل گاڑی کی چھت پر لگے کپڑے کو ہٹایا تو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہم اکیلے تھے۔ گھوڑ سوار اور میانہ بردار سب غائب تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہمارے کوچوان نے کوئی پھیر دار راستہ اختیار کیا تھا اور ہم پیچھے رہ گئے تھے۔ ہم ایک اجنبی گاؤں میں آ گئے تھے ان ساتھیوں کے ساتھ جن کو ہم جانتے تک نہیں تھے۔ ڈاکٹر آرام کرنے کے لیے کسی خالی مکان کی تلاش میں تھا لیکن کوئی مکان نہیں ملا۔ گاؤں والوں نے ہماری حالت پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ہم سے کہا کہ ہم اس گاؤں میں نہیں ٹھہر سکتے۔ لیکن ڈاکٹر نے ہمت سے کام لے کر ان کو اس بات پر راضی کیا کہ ہم چاہے کوئی بھی ہوں مگر یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ ہمیں پناہ دیں۔ آخر کار وہ ڈاکٹر سے بولے "حقیقت تو یہ ہے کہ گاؤں میں کوئی خالی مکان نہیں ہے۔ ہاں ایک بات کر سکتے ہو۔ گاؤں کے جنوبی کنارے پر برگد کے درخت کے سامنے ایک نیا مکان بن رہا ہے جو ابھی نامکمل ہے مگر رہنے کے لائق ہے۔ تم اس مکان میں کچھ وقت کے لیے رہ سکتے ہو۔" ہم خوشی خوشی بیل گاڑی سے نیچے اترے اور گارے سے بنے ہوئے

168
www.taemeernews.com



اس ڈھانچے میں داخل ہوئے۔ اس میں ایک طرف ایک ہی لائن میں کئی کمرے تھے۔ آگے صحن اور چاروں طرف دیوار تھی۔

ایک طرح سے ہم ڈاکٹر اور اس کی بیوی کے مہمان تھے اور وہ ہم پر بڑے مہربان تھے۔ ڈاکٹر بنگالی مسلمان تھا اور شاہ جہاں پور کی رجمنٹ میں ملازم تھا۔ لیکن 1857 میں جب رجمنٹ نے بریلی کی طرف کوچ کیا تو اس نے اس سے قطع تعلق کر لیا اور شہر میں کرائے کے مکان میں رہنے لگا جہاں اس کا ڈاکٹری کا پیشہ اچھا چل نکلا کیونکہ اس کے ہاتھ میں شفا تھی۔

ڈاکٹر کی سالیاں گڈھا کھود کر ایک تندور بنانے میں لگ گئیں۔ ایک نے آگ جلا کر اس پر دال چڑھا دی اور دوسری آٹا گوندھ کر چپاتیاں بنانے لگی۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر آکر بیٹھ گیا اور بڑی شائستگی سے امّی سے پوچھنے لگا کہ وہ کون ہیں اور کس صورت حال سے گزر رہی ہیں۔ امّی نے اسے سارا قصہ سنایا۔ تمام حالات سن کر اسے ہم لوگوں پر بہت ترس آیا اور وہ ہمارے لیے ہمدردی محسوس کرنے لگا۔

"کیا خیال ہے آپ کا۔" امّی نے پوچھا۔ "کیا واقعی انگریزی حکومت دوبارہ قائم ہو جائے گی؟"

"میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ کب ہو گی لیکن یقیناً ان کی حکومت پھر سے قائم ہو جائے گی۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں چونکہ اب آپ ہمارے ساتھ ہیں، اس لیے آپ ہم پر بھروسہ رکھیں اور کوئی کام ہو تو کہنے میں جھجکیں نہیں۔ اس وقت ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ جہاں تک ہو سکے ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔"

امّی ڈاکٹر کے خوش خلق رویے سے بہت متاثر تھیں۔ ہم نے ایک رات اور اگلا دن اس کے ساتھ گزارا۔ سورج چھپنے کے کافی دیر بعد جب ہر طرف سناٹا تھا اور برگد کے درخت پر پرندوں کی چہچہاہٹ بند ہو گئی تھی، ڈاکٹر امّی کے پاس آیا اور بولا:

"جاوید خان آیا ہے اور آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"اب کس لیے آیا ہے وہ؟" امّی نے پوچھا۔ "اب اسے ہم سے کیا کام ہے؟"

169
www.taemeernews.com



"وہ آپ سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "وہ یہاں اندر تو نہیں آسکتا لیکن آپ دروازے پر ہی اس سے بات کر سکتی ہیں۔"

امّی جاوید خان سے ملنے کے لیے چلی گئیں اور میں پُر تجسس انداز میں ان کی باتیں سننے کے لیے دیوار کے سائے میں کھڑی ہو گئی۔

"مریم" جاوید بولا۔ "میں تمھیں یہ بتانے آیا ہوں کہ فرنگیوں نے شاہ جہاں پور پر پھر قبضہ کرلیا ہے۔ تم ان کے پاس پہنچ جاؤ گی لیکن جو حفاظت میں نے تمھاری کی ہے اس کو بھولو گی تو نہیں۔"

"نہیں بھولوں گی۔ ہمیں پناہ دینے کے لیے تمھارا بہت شکریہ۔" امّی نے کہا۔ "میں کوٹھی والی اور کامران کی مہربانیوں کو بھی نہیں بھولوں گی۔"

"مجھے تم سے فقط ایک درخواست کرنی ہے۔" جاوید بھی ایک پیر تو کبھی دوسرے پیر پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"کہو کیا ہے" امّی نے پوچھا۔

"میں بخوبی جانتا ہوں کہ تمھاری بیٹی سے شادی کرنے کا وقت اب نکل چکا ہے۔" وہ بولا۔ "اب اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جانے سے پہلے مجھے ایک بار اسے دیکھنے کی اجازت تو دو گی؟"

"اس سے کیا ہو گا؟" امّی کہہ رہی تھیں لیکن کسی انوکھی ترنگ کے زیرِ اثر میں روشنی میں آگئی اور جاوید خان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

وہ ایک منٹ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا اور پہلی بار میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہی۔ پھر مسکرائے اور کچھ کہے بغیر وہ مڑا اور گھوڑے پر سوار ہو کر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

## آخری سفر

اگلی صبح ڈاکٹر نے امّی سے کہا "میں نے سنا ہے کہ کل انگریزی فوج شاہ

170
www.taemeernews.com



جہاں پور میں داخل ہو گئی ہے اور شہر میں دیوانی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ اب جبکہ امن بحال ہو گیا ہے تو کیا آپ ان کے پاس جائیں گی؟"

"مشورہ تو معقول ہے۔" امّی نے کہا "لیکن ہم وہاں کس کو پہچانیں گے؟"

"آپ اپنے اندازِ گفتگو، بول چال اور وضع قطع سے فوراً پہچانی جائیں گی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کا اپنا کوئی رشتہ دار آگیا ہو اور آپ کو تلاش کر رہا ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

اس کے بعد ڈاکٹر گاؤں کے مُکھیا کے پاس گیا۔ ان کو بتایا کہ امّی حقیقت میں یورپی خاتون ہیں جو قتلِ عام سے بچ نکلی تھیں اور اب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ شاہ جہاں پور جانا چاہتی ہیں چونکہ دیوانی حکومت پھر سے قائم ہو گئی ہے تو کیا کوئی اپنی بیل گاڑی میں اُن کو وہاں لے جا سکتا ہے؟"

"تم ہمیں کوئی نئی بات نہیں بتا رہے ہو۔" مُکھیا نے کہا۔ "جیسے ہی وہ لوگ تمھاری بیل گاڑی سے اترے تھے، ہم سمجھ گئے تھے کہ وہ کون ہیں۔"

"تم کیسے جان گئے تھے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تم مجھے کدو سمجھ رہے ہو؟" بزرگ بولا۔ "اُن کی چال ڈھال اور ان کی بات چیت سے ہمیں پتہ چل گیا تھا۔ ان کی ٹانگوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ یہ ننگے پاؤں زمین پر چلنے لائق تک نہیں ہیں۔ اس تپتی ریت پر ڈرتے ڈرتے قدم رکھنا اس کا ثبوت تھا۔ تو اب وہ شاہ جہاں پور واپس جانا چاہتی ہیں؟ ٹھیک ہے میں، گنگارام، خود ان کو اپنی بیل گاڑی میں لے جاؤں گا اور شاہ جہاں پور میں جس جگہ کہیں گی پہنچا دوں گا۔ کل صبح میں تیار رہوں گا۔"

ہم نے اپنا مختصر سا سامان اکٹھا کیا اور اگلے دن گنگارام کی بیل گاڑی میں بیٹھ کر شاہ جہاں پور کے لیے روانہ ہو گئے۔

سفر میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔ دوپہر کے بعد ہم قصبے میں پہنچ گئے تھے۔ ہم نے گنگارام سے اپنے پرانے گھر پر چھوڑنے کے لیے کہا کیونکہ ہمارے پاس اور کہیں جانے کی جگہ نہیں تھی۔ جونہی ہم اپنے پرانے مکان کے کھنڈر کے پاس رُکے

171
www.taemeernews.com



ہماری ملاقات مسٹر ریڈ مین سے ہوئی جس نے امّی کو بتایا کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ کیسے بچ نکلا تھا۔ اس نے بتایا کہ انگریز کمانڈر نے پورے ضلع پر پھر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ خود بریلی کی طرف بڑھ گیا ہے اور کرنل ہال کی کمان میں ایک مختصر سی فوج شاہ جہاں پور میں چھوڑ دی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ شہر ابھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ شہر کی مشرقی حد پر ابھی بھی فیض آباد کے مولوی کا قبضہ ہے۔ اس نے ہمیں اس کوارٹر میں رکنے کے لیے مشورہ دیا جس میں وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ امّی نے ہچکچاتے ہوئے اس کے مشورے سے اتفاق کیا اور ہم ایک رات کے لیے اس مکان میں چلے گئے جس میں ریڈ مین پناہ گزیں تھا کیونکہ ابھی ہم بے گھر تھے اور ہمارے ساتھ کوئی مرد بھی تو نہیں تھا۔ یہاں ہماری ملاقات تین آدمیوں سے ہوئی جن کو ماموں نے بھرت پور سے ہمیں لانے کے لیے بھیجا تھا۔ ہمیں پتہ چلا کہ ظلیا کے ذریعے بھیجا ہوا پیغام ماموں کو مل گیا تھا اور اس نے فوراً ہمیں بچانے کے لیے اقدام کر لیے تھے۔ امّی اپنے بھائی کی تحریر دیکھ کر اور شفقت و تشویش بھرا خط پڑھ کر جس میں اس نے بھرت پور آنے کی دعوت دی تھی رو پڑیں۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے ساتھ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کر سکتی ہیں۔

3 مئی 1858 کو اتوار کا دن تھا کہ صبح ہی صبح پلو کی ماں پلو کے بغیر ہمارے پاس آئی۔ وہ اس قدر پریشان تھی کہ ہم سمجھے پلو مارا گیا۔ لیکن بعد میں ہمارے کہنے پر اس نے بتایا کہ پلو نے اپنی مرضی سے وہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ منگل خان سے اسے اتنا انس ہو گیا تھا کہ اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ماں اکیلی ہی چلنے کو تیار ہوئی تھی، یہ سوچ کر وہ نرم پڑ جائے گا اور اس کے پیچھے چلا آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ اسے پٹھان کا ساتھ اچھا لگا تھا اور وہ اس کے گھر میں ہی رہتا رہا۔ ہمیں اس کا یہ رویہ پسند نہیں آیا۔

ہم پلو کی ماں کی دکھ بھری کہانی سن رہے تھے کہ مسٹر ریڈ مین کرنل ہال کے کیمپ سے لوٹ آیا اور ہمیں ناشتے کے لیے بلا بھیجا۔ ابھی ہم دو لقمے ہی منہ میں ڈال پائے تھے کہ اچانک شور مچ گیا کہ فیض آباد کی مولوی کی کمان میں باغی فوج دریائے

172
www.taemeernews.com



جنات کو کشتیوں کے پل سے پار کر رہی ہے۔ ماموں کا ملازم نسیم خان جو اپنے گھوڑے کو دریا پر نہلانے لے گیا تھا دوڑا ہوا آیا اور خبر دی کہ دشمن نے کرنل کی مختصر سی فوج پر جو پرانی جیل میں پڑی تھی حملہ بول دیا ہے۔ تمام فضا لڑائی سے گونج رہی تھی۔ لڑائی کے بگل بج اٹھے تھے۔ گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ میدان میں بے سوار لوگوں کی تلواروں کی جھنجھناہٹ کی آواز، بندوقوں کے چلنے کی آواز اور ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے لوگوں کا پریشان کن شور، ان سب سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ ایک کثیر فوج نے انگریزوں کے چھوٹے گروہ پر حملہ بول دیا ہے۔

ہمارے پاس اپنی حفاظت کے لیے وقت بہت کم تھا۔ گنگا رام کی بیل گاڑی ابھی ہمارے پاس ہی تھی۔ ریڈ مین نے اگرچہ امی کو یقین دلایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن امی نے گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا جہاں وہ سوچتی تھیں ہم محفوظ رہیں گے۔ نانی، امی، میں، آنیٹ، پلٹو کی ماں اور ریڈ مین کی لڑکی وِکی ہم سب بیل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ابھی ہم احاطے کے دروازے سے باہر ہی نکلے تھے کہ ہمیں کچھ شور سنائی دیا۔ کوئی دس بارہ گرد اڑاتے ہوئے باغی سوار ہوا میں تلواریں گھماتے ہوئے تیزی سے ہماری طرف بڑھے اور بیل گاڑی کو گھیر لیا۔ اُن میں سے ایک کہہ رہا تھا: "کچھ تو یہ رہے۔ ختم کردو ان کو۔" ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی وہ ہمارے سر سے نقاب ہٹا دیں گے اور چمکتی ہوئی تلواریں ہمارے سینے میں اتار دیں گے۔ معصوم وِکی نے دونوں ہاتھ اپنی گردن میں ڈال لیے اور بولی "سب اپنے اپنے ہاتھ گردن میں ڈال دیں تاکہ صرف ہماری انگلیاں ہی کٹیں اور گردنیں بچ جائیں۔" امی کے سوا سب گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ ان کے چہرے پر مہینوں کی تکلیف کے غم نمایاں تھے اور تذبذب سے جھریاں پڑ گئی تھیں۔ انھوں نے چھرا ہاتھ میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے پردہ ہٹا کر اپنا سر باہر نکالا۔ اس کی صورت کو دیکھ کر وہ بدمعاش جو ہمارے خون کے پیاسے تھے خوف زدہ ہو گئے اور انھوں نے لگامیں کھینچ لیں۔

"کیا چاہتے ہو ہم سے نوجوانو؟" امی نے پوچھا۔ "اپنی عزت کو بچانے اور

173
www.taemeernews.com



موت کے خوف سے شہر کو چھوڑ جانے میں یہ مجبور عورتیں کوئی انوکھی بات نہیں کر رہی ہیں۔"

وہ اور کچھ سننے کے لیے نہیں رُکے۔ یقین کرتے ہوئے کہ ہم مسلمان ہیں اور شہر چھوڑ کر جا رہی ہیں وہ مڑ گئے اور نسیم خان کو پکڑ لیا جو ہمارے پیچھے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے کہا کہ وہ دیندار ہے بیل گاڑی میں بیٹھی عورتیں اس کی رشتہ دار ہیں جو شہر کو چھوڑ کر جا رہی ہیں کیونکہ فرنگیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔

سپاہی جب چلے گئے تو گنگارام بیل گاڑی سے اتر کر ہاتھ جوڑ کر امّی کے روبرو کھڑا ہو گیا اور بولا "خوب، جسمانی طور پر تم چاہے کمزور ہو مگر تمھارے اندر دیوی کی سی ہمت ہے۔ میری نظر میں کوئی اور عورت نہیں جو ان لوگوں سے نپٹ سکتی تھی۔"

خطرات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ بیل گاڑی ٹوٹ کر ایک طرف گر گئی۔ اس کی دُھری ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی مرمت بھی ناممکن تھی۔ ہمیں ہر حالت میں آگے بڑھنا تھا تاکہ ہم پھر کہیں کسی دوسرے فوجی دستے کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ توپوں کے گولے کی گھر گھر، بندوقوں کی چلنے کی آواز اور سپاہیوں کی چیخ و پکار ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ ہم نے بیل گاڑی سے اتر کر گنگارام کو الوداع کہا اور پیدل چل پڑے۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کدھر چل رہے ہیں۔ لیکن ہمارا ارادہ جہاں تک ہو سکے لڑائی کے میدان سے دور نکل جانے کا تھا۔

تپتی ہوئی دھوپ میں ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہمیں بڑی سڑک پر سامان سے لدی ہوئی کچھ گاڑیاں ملیں۔ وہ انگریزی فوج کی تھیں اور ہماری طرح بریلی جا رہی تھیں۔ ایک سکھ محافظ نے ہمیں دیکھا اور اس کو ہم پر ترس آ گیا۔ امّی کو تیز بخار تھا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ انھیں وہیں چھوڑ دیا جائے اور ہم جا کر کسی محفوظ جگہ کی تلاش کریں۔ نسیم خان گھوڑے سے اترا اور اس نے امّی کو گھوڑے پر بٹھا دیا اور انھیں سہارا دیتے ہوئے خود پیدل چلنے لگا۔ اسی اثنا میں ایک اور حادثہ پیش آیا۔ نسیم خان گھوڑے سے اتر رہا تھا کہ اچانک اس کی پستول چل گئی اور ہم پھر دہشت میں پڑ گئے۔

www.taemeernews.com



نسیم خان بذاتِ خود حیران و پریشان تھا۔ اس نے کئی بار اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور آخر کار بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ "میں بھی کتنا احمق ہوں۔" وہ بولا۔ "ہم جب مولوی کے آدمیوں سے ملے تھے تو میں نے پستول کا گھوڑا چڑھا دیا تھا لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے یہ اس وقت چلتی ہے جب دشمن سامنے نہیں ہوتا۔"

اس پر سکھ سپاہیوں نے قہقہہ لگایا اور ہم بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ بات الگ ہے کہ ہماری ہنسی مصنوعی تھی۔ اس کے بعد سکھ سپاہیوں نے سامان سے بھری ہوئی ایک گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ آنیٹ، وِکی اور میں نے خوشی خوشی اس تجویز کو منظور کر لیا کیونکہ ہم بے حد تھک چکے تھے۔

تین چار میل چل کر ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے جہاں ہمیں ٹھہرنے کی جگہ مل گئی۔ دوپہر ہو چکی تھی اور سامان والی گاڑی میں تپتی دھوپ سے کچھ بچاؤ نہیں تھا۔ ہم گاؤں والوں کی مہمان نوازی سے بہت خوش تھے۔

دو دن کے بعد ہم نے ایک گاڑی کرائے پر لی اور جنوب کا رُخ کیا۔ بڑی سڑک کو چھوڑ کر ہم چار دن میں فتح گڑھ پہنچے۔ وہاں ہم ریڈمین کے گھر والوں سے جا ملے۔ امی نے کلکٹر کو بلا بھیجا جس نے ہمیں مدد کے طور پر کچھ روپے دیے اور ہم قدرے آرام سے بھرت پور تک اپنا سفر جاری رکھ سکے۔

دس دن بعد ہم ماموں کے گھر میں تھے جہاں ہمیں آرام، پناہ اور سکون ملا۔ لیکن ایک افواہ نے کہ باغی فوج اس علاقے سے گزرنے والی ہے، ہمیں پھر گھبراہٹ میں ڈال دیا۔ اُدھر پچھلے برس کے حادثات میرے ذہن پر اس قدر چھائے ہوئے تھے کہ چرچ میں دوڑتے بھاگتے تلوار بازوں کو ہر کسی کا قتل کرنے کے بھیانک خواب میری نیند حرام کر دیتے اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی۔ تاہم بھرت پور پہنچتے ہی ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ہم سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ بھلے ہی ابو کے بغیر وہ پہلے والی بات نہیں تھی۔

لالا رام جی لال اور اس کے گھر والوں کے بارے میں ہم نے پھر کبھی نہ سنا۔ ہم اپنے تئیں اس کی مہربانیوں کا اور خود اپنی ذات کو خطرے میں ڈال کر ہماری حفاظت

175
www.taemeernews.com



کرنے کے لیے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سوائے اس کے کہ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ بریلی میں سکونت پذیر ہو گیا ہے اور کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

ہم نے یہ بھی سنا کہ حالات کے معمول پر آنے کے بعد کوٹھی والی، کامران اور ان کے گھر والے آخر شاہ جہاں پور لوٹ آئے تھے۔ لیکن جاوید خان ایسا غائب ہوا کہ پھر کہیں دکھائی نہ دیا۔ غالباً وہ نیپال کی طرف بھاگ گیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پکڑا گیا ہو اور دوسرے باغیوں کے ساتھ پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہو۔ رازدارانہ طور پر میں یہ چاہتی تھی کہ وہ بھاگنے میں کامیاب ہو جائے۔ ان مہینوں کی یاد کر کے جب ہم اس کی قید میں تھے، میں پوشیدہ طور پر اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ بڑا کوڑھ مغز، خونخوار اور اکثر ظالم تھا۔ لیکن بڑا خوبصورت اور جواں مرد تھا۔ اس کی رگوں میں کچھ نہ کچھ نوابانہ خون بھی تھا جس کو اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ مجھے اس لیے بھی پسند تھا کہ میں اس کی نظروں میں بہت خوبصورت تھی۔

رسکن بونڈ 1934ء میں کسولی، ہماچل پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کی نشوونما جمنا نگر (گجرات)، دہرہ دون اور شملہ میں ہوئی۔ رسکن بونڈ نے پہلا ناول The Room on the Roof سترہ سال کی عمر میں لکھا تھا جس پر 1957ء میں انھیں John Lliewellyn Rhys Memorial Prize سے نوازا گیا۔

رسکن بونڈ نے اپنے پینتیس سالہ تخلیقی سفر کے دوران سو سے زائد کہانیاں، مضامین، ناول اور بچوں کے لیے تیس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔

رسکن بونڈ کی کہانیوں کے دو مجموعے The Night Train at Deoli اور Time Stops at Shamli پینگوِن انڈیا سے شائع ہو چکے ہیں۔

ان دنوں رسکن بونڈ مسوری میں قیام پذیر ہیں۔ اس کتاب میں شامل ان کی بیشتر کہانیاں مسوری میں ہی لکھی گئیں۔

اس کتاب کے مترجم ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی ہیں جو اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر سولن (ہماچل پردیش) میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

Doon ka Sabza (Urdu)
ISBN 81-260-1941-7 Rs. 125